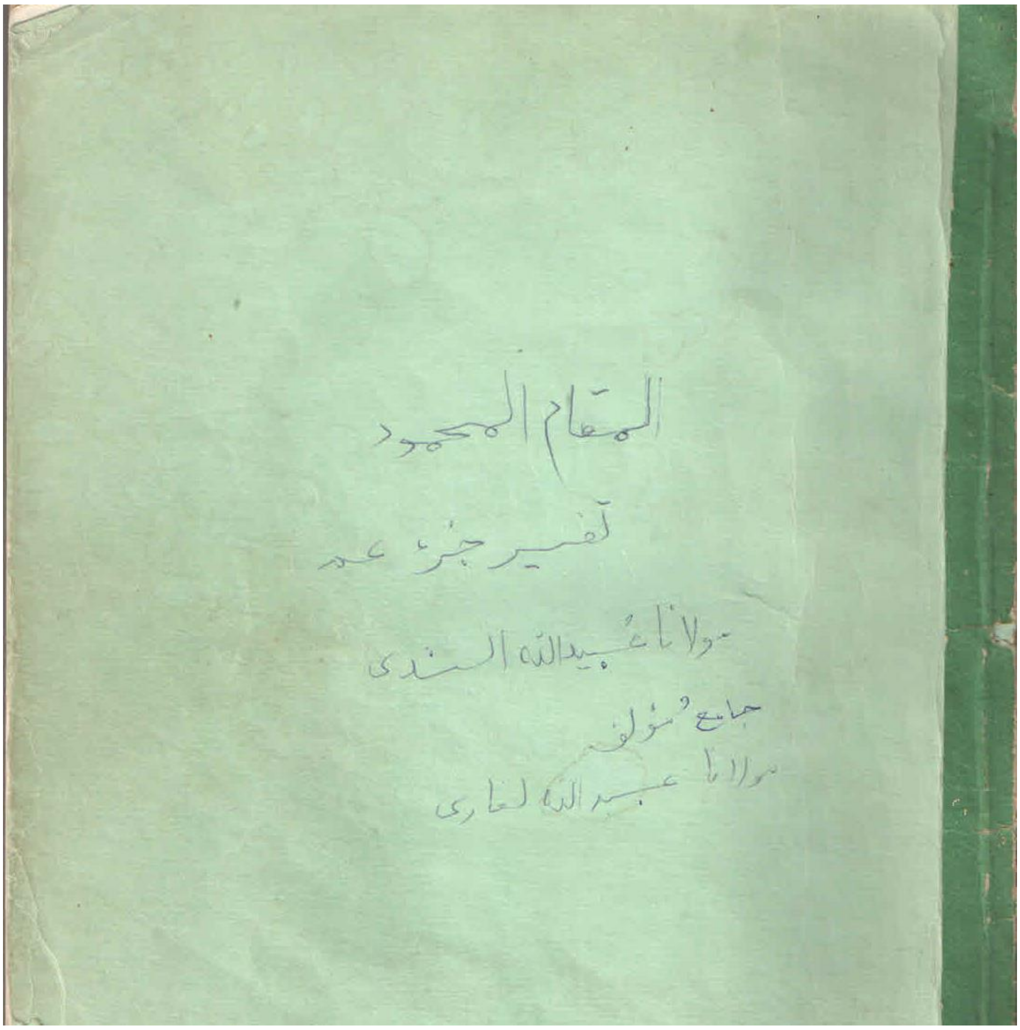



**المقام المحمود: تفسير سورة عم يتسائلون الي الناس و الفاتحه**

**حصه دوئم :**

**سورة واضحيٰ الي الناس و الفاتحه**

**صفحه 111 تا 227 وغيره**

**تفسير شيخ مولانا عبيدالله السندي**

**تاليف : مولانا عبدالله لغاري**

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ٥

# سورۃ الضحیٰ مکیۃ

پچھلی دونوں سورتیں قرآن مجید کی حکمت کے اصول میں نہایت اعلیٰ درجہ رکھتی ہیں۔ اس مشکل مسئلہ کو اس وضاحت سے نہ تو کسی حکمت کی کتاب نے اور نہ کسی کتبِ الٰہی نے حل کیا ہے۔ مگر اُن موٹی عقل والوں کا برا ہو کہ وہ فلسفے اور حکمت کے نام سے قرآن مجید کی آیات کو حل کرنے سے گھبراتے ہیں۔ اور عام مفسرین کی یہ حالت ہے کہ وہ لے دے کر یہ کہتے ہیں کہ یہ سورتیں حضرت ابوبکر صدیق رضہ کی فضیلت میں آئی ہیں اور یہی اُن کا آخری تیر ہے۔ مانا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضہ کو ان آیات سے مناسبت تھی مگر ان آیتوں کو کسی خاص شخص کے فعل سے کیا تعلق؟ اور جو جھگڑے اسلام میں پچاس برس بعد پیدا ہوئے بلکہ کوئی سو یا ڈیڑھ سو برس بعد پیدا ہوئے، وہ تمام جھگڑے قرآن مجید میں لا کر رکھ دیے گئے ہیں.

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو آدمی قرآن مجید کو پڑھنا چاہے وہ پہلے ان جھگڑوں سے نمٹ لے اور اس کے بعد قرآن مجید پڑھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا اختلاف اصل میں سیدنا عثمان رضہ سے ہوا تھا۔ مگر شیعوں (حضرت علی رضہ کے طرفدار لوگوں) نے سو برس کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضہ اور حضرت عمر رضہ پر بھی اعتراض کرنے شروع کر دیے۔ ان آیات کو جب حضرت ابوبکر صدیق رضہ کی شان میں خاص کر دیا جائے تو جو لوگ صحابہؓ کرام کے مخالف ہیں (یعنی شیعہ) وہ اِس جھگڑے میں گویا قرآن مجید پڑھنے سے محروم ہو گئے.

نبی اپنے زمانے میں انسانیت کا مجسم ہوتا ہے۔ آس کے حالات سے عام انسانی مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔ اور حکمت انسانی شروع کرنے والے لوگوں کے لیے پہلے تمثیلی مثالوں سے کام لیا جاتا ہے۔ اب انسانیت کا ایک عام مسئلہ ہے کہ انسانیت ہمیشہ عقل کی روشنی میں ترقی کرتی ہے۔ اور انسانیت پر جو تنزل کے دور آتے ہیں وہ عارضی ہوتے ہیں، آس کے طبعی ارتقاء کو روکا نہیں جا سکتا۔ یہ مسئلہ اِس سورت میں بتلایا گیا ہے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال میں.

فَاَغۡنٰی (۸) فَاَمَّا الۡیَتِیۡمَ فَلَا تَقۡہَرۡ (۹) وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنۡہَرۡ (۱۰) وَ اَمَّا

پھر بے پروا کر دیا سو جو یتیم ہو اُس کو مت دبا اور جو مانگتا ہو اُس کو مت جھڑک اور جو

بِنِعۡمَۃِ رَبِّکَ فَحَدِّثۡ (۱۱)

احسان ہے تیرے رب کا سو بیان کر

شروع نبوت میں اتفاقی واقعہ ہوا کہ وحی چند روز آ کر رک گئی۔ مکہ کے مخالف لوگوں نے استہزا شروع کر دیا۔ اور آپ کی طبیعت پر بھی اس کا بہت برا اثر ہوا۔ یہاں تک کہ آپ کا جی چاہتا تھا کہ پہاڑ کے اوپر چڑھ کر اپنے آپ کو نیچے گرا دیں اس حالت میں روح القدس آپ کو تسلی دیتے ہیں اور آپ یہ خیال چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ پریشانی آپ کو تقریباً چالیس دن تک رہی۔ اور اس پریشانی کے ختم ہونے پر یہ سورت نازل ہوئی.

آیت (۱) والضحیٰ :- جس طرح دوپہر کے وقت دن تیز ہوتا ہے, اُس کی قسم ہے۔

آیت (۲) واللیل إذا سجیٰ :- اور رات جب وہ اندھیرا کر دے, وہ گواہ ہے کہ

آیت (۳) ما ودعك ربك و ما قلیٰ :- تیرے پروردگار نے نہ تو تجھے چھوڑا ہے اور نہ تجھ سے ناراض ہوا۔ یعنی جس طرح دوپہر کے بعد رات آتی ہے, تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کے بعد دوسرا دن ہی نہیں آئے گا۔ دن کے بعد رات کا نہ آنا بذاتِ خود نظام کی بربادی ہونے کی دلیل ہے۔ تو اس سے یہ نتیجہ کبھی نہ نکالنا چاہیے کہ ترقی کے بعد اگر چند روز حالت اس کے برخلاف ہو جائے تو یہ سمجھ لیا جائے کہ بس اب ترقی بند ہو گئی. جیسے رات کے بعد دوسرا دن اُس کی تکمیل کر دیتا ہے. ایسے ہی اس بندش وحی کے بعد جو وحی آئے گی وہ اس بندش کی تکمیل کر دے گی۔ اور آئندہ تیری تعلیم کی ترقی کے دور بھی اسی طرح ہوں گے جس سے انسانیت ترقی کرے گی.

آیت (۴) وللآخرة خیر لك من الاولیٰ :- پہلی حالت کی بنسبت تیرے لیے پچھلی حالت بہتر ہے۔ یہی ارتقا ہے کہ ہر پچھلی حالت پہلی حالت سے اچھی ہو۔ عام مفسرین نے اس کو دنیا اور آخرت پر محمول کرکے اس کے مضمون کو ذرا کمزور کر دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر پچھلی حالت پہلی حالت سے اچھی ہوتی رہے گی۔

تک کہ جو کچھ تیرا مقصد ہے وہ پورا ہو جائے.

آیت (۵) و لسوف یعطیك ربك فترضیٰ:- تجھے تیرا پروردگار دے گا، اور تو
ہو جائے گا۔ اب اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول نبوت کے زمانے میں رسول
صلی اللہ علیہ و سلم کے دل میں کوئی مقصد تھا۔ وہ مقصد یہ تھا کہ ہماری قوم
جو بری حالت ہے وہ دور ہو جائے اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی جو دعا ہے وہ
حق میں پوری آترے اور وہ کام میں کروں۔ اس لیے کہ یہ لوگ (عرب) اس
ابراہیمی کو نسل در نسل نقل کرتے چلے آئے ہیں۔ بعینہ اسی طرح جس
آج کل مسلمان حضرت مہدی کا انتظار کر رہے ہیں.

غرض اس میں وعدہ دیا گیا ہے کہ اے رسول! تیری حالت میں ارتقا ہوتا جائے گا،
تک کہ تیرا مطلب پورا ہو جائے.

دوسری قوموں سے مباحثہ کرنے والے مسلمانوں نے نبوت کے یہ معنی مقرر کیے
کہ نبی کے دل میں کوئی خیال نہیں ہوتا۔ اور خدائے تعالیٰ اپنی طرف سے نبی
دل میں زبردستی ایک بات ڈال دیتا ہے. ان مباحثہ کرنے والے مسلمانوں کے اس
کا لحاظ رکھ کر آن کے مقلد یہ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ و سلم
سامنے کوئی مقصد نہیں تھا۔ اب اِس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کے سامنے ایک
مقصد تھا۔ اس واسطے وہ اب اس کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ مقصد یہ تھا کہ
قیامت کے دن اپنی امت کو بخشوا لیں گے۔ مناظرہ کرنے والے اِس بات کو بھول
ہیں کہ حکمت الٰہی کا تقاضا ہے کہ جو آدمی کوئی کام کرے، اس میں پہلے
کام کرنے کی استعداد ہونی چاہیے۔ اِسی طرح نبی جو نبوت کا کام سر انجام دے گا
کے لیے نبوت کی استعداد ضروری چیز ہے۔ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ و سلم
طبیعت میں طبعی طور پر یہ بات آئے گی کہ آن کی قوم ذلت سے بچے۔ اور آن کی
میں جو تاریخی فخر رکھا گیا ہے وہ قوم کو حاصل ہو۔ آمت کے بخشوانے کا مسئلہ
تر مسیح علیہ السلام کے کفارہ کی نقل ہے اور یہ دوسری صدی کے بعد ہوا، جب
عیسائی قوموں سے ملے.

آیت (۶) الم یجدك یتیماً فاویٰ:- آپ کی زندگی کا ابتدائی واقعہ ہے کہ آپ کے
بچپن ہی میں مصیبت پڑ گئی۔ آپ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے۔ مگر اللہ تعالیٰ
آپ کے لیے ایسا سامان پیدا کر دیا کہ آپ کے خاندان کا سب سے بڑا آدمی
عبدالمطلب) آپ کی تربیت پر لگ گیا.

لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اب نبوت کی تعلیم ختم ہو جائے گی۔ یعنی
چونکہ خاتم الانبیاء ہیں اور نبوت کے خاتمے کی طرح اب نبوت کی تعلیم بھی پوری

ہو جائے گی۔ اس واسطے اب یہاں سمجھایا جا رہا ہے کہ لوگوں کو ایسا خیال نہ کرنا چاہیے۔ آن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی زندگی پر غور کرنا چاہیے کہ آپ بچپن ہی میں یتیم ہوگئے اور آپ کا یتیم ہونا ایک قدرتی واقعہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی پرورش کا خیال پہلے آپ کے دادا کے اور آن کے بعد آپ کے چچا کے دل میں زیادہ شدت سے ڈال دیا اب آپ کے لیے کوئی ایسا موقع نہیں تھا جس میں آپ کو ترقی نہ ہوئی ہو۔

آیت (۷) و وجدك ضالاً فهدىٰ :- رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک مقصد تھا۔ آپ اس مقصد تک پہنچنے کے لیے دماغ پر پورا زور لگاتے ہیں مگر اس کے متعلق کوئی راستہ نہیں پاتے۔ آپ کے دل میں یہ حیرانی اور گمراہی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے راستہ کھول دیا اور وحی کا آنا شروع ہوگیا۔ اقوام عالم کی آزادی کا نسخہ مل گیا۔ اس کے دو جز تھے۔ ایک اقرء یعنی تعلیم اور دوسرا اللہ تعالیٰ کی غلامی یعنی لا الٰہ الا اللہ۔ کسی کی بادشاہی کا اقرار نہ کیا جائے بلکہ سلطنت اللہ کی ہے۔ آس کی ہدایت کی۔

عیسائی اور یہودی وغیرہ اپنے انبیاء کو بشریت کے اوپر فوق العادت ہستی سمجھتے ہیں۔ اسی طرح آن کی نقل میں مسلمان بھی انبیاء کی نسبت بشری احکام کا کھلے طور پر آج کل اقرار نہیں کرتے۔ عیسائی مسیح علیہ السلام کو خدا کہتے ہیں۔ یہودی حضرت عزیر کو خدا کہتے ہیں اور ہنود رامچندر اور کرشن کو خدا کہتے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کا بھی جی چاہتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی وہی شان الٰہی آجائے۔ مسلمانوں میں اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بشریت کی باتیں ذکر کی جائیں (یعنی کہا جائے کہ آپ بشر تھے) تو وہ اسے پسند نہیں کرتے۔

آج کل مسلمانوں پر گمراہی کا لفظ بہت گراں گذرتا ہے۔ اور اب اس کی تعبیر یہ بناتے ہیں کہ ایک رات ایسا اتفاق ہوا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے بیابان میں کہیں راستہ بھول گئے اور گھر نہیں پہنچ سکے۔ تمام خاندان پریشان رہا اور آپ کی تلاش کرتا رہا مگر آپ نہ مل سکے۔ آخر میں اللہ تعالیٰ نے خود ہی راستہ بتا دیا۔ اور آپ گھر پہنچ گئے۔ یہ بچپن کا واقعہ ہے۔ اور لوگ اس کو اِس آیت کا مصداق بتاتے ہیں۔ قرآن مجید میں واضح کر دیا گیا ہے ما کنت تدری ما الکتاب و لا الایمان :- تو کتاب (پروگرام) اور قانون و ایمان یعنی نظریات صحیحہ (جس پر پروگرام کی بنیاد رکھی جاتی ہے) نہیں جانتا تھا اور ہم نے وہ تجھ کو بتلائے۔ اس آیت کی صحیح تفسیر ہے۔

آیت (۸) و وجدك عائلاً :- عیال دار آدمی جسے خرچ کے لیے ضرورت ہو۔ رسول
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ غنا اصل میں نفس کی غنا ہے۔ یعنی انسان کا
سی ہونا چاہیے۔ "تونگری بدل ست نہ بمال"۔ اس میں شک نہیں کہ رسول
صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سی مالی ضرورتیں تھیں مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک
دیا تھا اور اُس کا اثر آپ کے اہل بیت پر پڑا (اہل بیت بھی آپ کی طرح
رکھتے تھے)۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک بہت بڑی شخصیت کے
مگر آپ کے اہل بیت کی بھی یہ حالت تھی کہ وہ تنگی کے موقع پر شکایت
نہیں لاتے تھے۔

کام کرنے والوں کے لیے اس قسم کی اخلاقی قوت ایک بہت بڑی نعمت
ہے۔ مفسّرین اِس آیت کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں کہ آپ کو ایک دفعہ کہیں
تھوڑا سا مال حاصل ہوا اور وہ آپ نے خرچ کر دیا، تو اس آیت کی تفسیر
تھوڑے مال کا ذکر کرنا ایک بہت بھاری غلطی ہے اس لیے کہ وہ مال رسول کریم
وسلم کی تمام زندگی کے لیے کبھی کافی نہیں ہو سکتا تھا تو چند روزہ استغنا کا
میں کیسے ذکر ہو سکتا ہے۔ جَبَلی قوموں میں یہ عادت ہے کہ جب اُن کا
سخی اور مطعم ہوتا ہے تو اُس کی قوم اپنے مال میں سے کچھ حصہ خود بخود
ہے تاکہ وہ خرچ کریں اور ہماری قوم کی ناموری ہو۔ اسی طرح اکثر
اپنا مال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیتے تھے۔ مفسر کو چاہیے کہ ہمیشہ
پر نظر رکھے۔

آیت (۹) فاما الیتیم فلا تقهر :- رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طبعی حالات پر
غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ عنایت الٰہی آپ کو ترقی کے راستے پر چلا رہی
چند روزہ وحی کی بندش کو کیسے نقصان سمجھ لیا گیا ہے۔ یتیم کی صفت
ہے بے کسی اور محتاجی، یعنی بے کسوں کی ہمت بڑھاؤ، اُن کے پشتیبان بنو۔
نے اُن کی ہمت نہ بڑھائی تو اُن کی کمر ٹوٹ جائے گی:

ع چہ غم دیوار امت را چو باشد نوح پشتیباں۔

چالیس دن کے قریب آپ پر وحی نہیں آئی۔ تو اس کی حکمت یہ تھی کہ
وحی کی بندش کے زمانے میں اپنے لیے پیروکار جمع کیے جائیں اور اُن کو اپنے
کی تعلیم دی جائے اور یہ کام ساتھ ساتھ ہوتا چلا جائے۔ جس قدر قرآن
نازل ہو، اُسے سمجھنے والی اور سوچنے والی جماعت آپ کے پاس ہمیشہ
رہے۔

اب جو پیروکار تلاش کرنے ہیں، اس کے دو درجے ہیں ایک تو یتیموں کے بچے

کہ ان پر سختی کرنی چھوڑدی جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ خود بخود جمع ہوتے جائیں گے۔ اور دوسرے سائل۔ یتیم کا لازمی وصف بے کسی ہے۔ بے کس و مظلوم جماعت کی مدد کرو۔

آیت (۱۰) و اما السائل فلا تنهر*:- جو محتاج ہے اور لوگوں سے اپنی حالت بیان کرکے مانگ رہا ہے، اُسے مت دھمکاؤ یعنی اُس سے اخلاق سے پیش آؤ تو وہ بھی تمہارے پاس جمع ہوتے جائیں گے۔ محتاج کے ساتھ اگر اچھی بات کی جائے تو اس بات سے بھی اُس کو سکون ملتا ہے۔ اور طالب علم کو نرمی سے سمجھاؤ۔

آیت (۱۱) اما بنعمت ربك فحدث :- اپنے اللہ تعالیٰ کی نعمت یعنی اُن کو قرآن مجید سکھاؤ۔ غرض فرصت کا وقت جو دیا گیا ہے وہ اس کام کے لیے ہے کہ اس عرصہ میں اپنے پیروکار تلاش کیے جائیں جو آگے چل کر جماعتی طور پر مدد دے سکیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اگر چند روز تک وحی نازل نہیں ہوئی تو اس سے آپ کی ترقی میں رکاوٹ نہیں ڈالی گئی۔

اسی طرح اگر نوع انسانی کے متعلق قیاس کیا جائے تو اس میں بعض واقعات ایسے نظر آتے ہیں کہ جن سے اُن کی ترقی رک جاتی ہے۔ مگر جب گہری نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ رکاوٹیں بھی ترقی کی بعض ضرورتیں پوری کرنے والی ثابت ہوں گی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی جماعت کو قرآن مجید سکھانے کی تاکید کی گئی ہے۔ اِس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہوگا کہ انسانی نوع علم سے ترقی کرتی ہے۔

آیت (۱۲) و لسوف يعطيك ربك فترضى :- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اعقل اہل الارض و اعلم اہل الارض ہیں۔ آپ میں سب صفات و اخلاق اعلیٰ سے اعلیٰ موجود تھے اور آپ نہایت رحیم اور نرم دل تھے۔ کسی پر ظلم ہوتا ہوا دیکھ نہیں سکتے تھے۔ اس لیے حلف الفضول بھی آپ کی سعی سے قائم ہوئی اور آپ اُس کے ممبر تھے۔ ایک موقع پر جب ابوجہل نے ایک آدمی کا حق نہ دیا تو اُس مظلوم شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر شکایت کی۔ آپ ابو جہل کے گھر تشریف لے گئے اور دستک دی اور اُس سے کہا کہ اِس شخص کا حق دو۔ تو اُس نے دے دیا۔ کیونکہ ابوجہل کو معلوم تھا کہ اگر آپ کے آنے پر بھی اُس کو حق نہ دیا گیا تو تمام ممبر حلف الفضول جمع ہو کر مقابلہ کریں گے۔

* سائل سے مراد طالب العلم ہے یعنی طالب علموں پر رحم کرو۔ اکثر استادوں اور معلموں کو دیکھا جاتا ہے کہ طالب علم اگر کوئی بات پوچھے تو غصہ میں آجاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نوکر نہیں ہیں، فی سبیل اللہ پڑھاتے ہیں۔

آپ نے عرب کی حالت بری دیکھی۔ شام گئے وہاں کے آبادکاروں اور رعایا کی حالت دیکھی۔ یمن کی حالت معلوم تھی۔ ایک روایت ضعیف میں آتا ہے کہ آپ نے عراق کی حالت دیکھی۔ اُن کی تباہ حالی تو حیوانوں سے بھی بدتر تھی (دیکھو حجۃ اللہ البالغہ)۔ آپ کا یہ مقصد تھا کہ نوع انسانی کو ابتر حالت سے نکال کر اور غلامی سے نکال کر آزادی کے میدان میں لایا جائے۔ یہ ایک ایسا نسخہ عطا ہوا ہے جو انسانیت کے لیے ابدالآباد تک مفید ہے۔ ایک یہ کہ:- یا ایھاالناس اعبدو ربکم الذی خلقکم والذین من قبلکم الیٰ قولہ و انتم تعلمون :- یعنی انسان کو تمدن کی حالت میں دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک آزادی رائے یعنی اُن کی رائے بھی سنی جائے اور دوسرا پیٹ کا مسئلہ حل ہو جائے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لا إله إلا الله : یعنی اللہ تعالیٰ کی غلامی کرو، تمہارا خالق اور رب وھی ہے۔ اور جو تم میں رتبۃً یا زماناً بزرگ ہیں، اُن کا رب اور خالق وھی ہے۔ لعلکم تتقون تب تم جاکر عدالت قائم کرو گے* یہ معنیٰ ہے تقویٰ کا جس سے آزادی رائے پیدا ہوتی ہے۔ باقی رہا پیٹ کا مسئلہ، زمین کو تمہارے لیے آزاد بنادیا، اور سورج اور چاند کی روشنی مفت ہے اور برسات بھی پانی سے برستی ہے اور میوے تمہارا رزق ہیں۔ اس زمین پر کسی کو مالکانہ قبضہ کرنے مت دو۔ اور اس پر خدا کی حکومت کے مقابلہ میں دوسری کوئی حکومت مت قائم کرنے دو، ورنہ وہ ٹیکس پر ٹیکس اور محصولات لگا کر تم کو غلام بنالیں گے۔ و انتم تعلمون تمہاری کانشنس یہ قبول نہیں کرتی یعنی انسانوں کے دل سے اپیل ہے.

دوسری تعلیم اقرأ :- آپ کو یہ پسند تھا اور مرغوب تھا کہ انسانیت اِس نسخہ کو قبول کرلے تو کہا گیا و لسوف یعطیك - جیسے ایک طالب علم کو کہا جائے کہ جتنے نمبر تم چاہتے ہو لکھ دو، ہم اتنے ھی دے دیں گے- یعنی اقوام عالم اس کو قبول کرلے گی۔ آپ کو عرب اور قیصر و کسریٰ کی رعایا کو ان سے چھڑانا تھا یہ پہلا مقصد تھا۔ نیز اقوام عالم یعنی تمام انسانیت کو بادشاھوں رہبان و احبار اور سرمایہ پرست کے ظلموں سے نجات دلوانی تھی، تو آپ کو تسلی دی گئی کہ یہ سب کچھ آپ کو مل جائے گا.

حضرت مولانا مولوی نجم الدین صاحب مرحوم (پروفیسر اورنٹیل کالج لاھور) فرماتے تھے کہ میرے خیال میں یوں آتا ہے کہ والفجر سے مراد ثمود کی قوم کی ھلاکت ہے اور ولیال عشر یعنی عشرۂ محرم جس میں موسیٰ علیہ السلام نے خروج کی تیاری کی اور والشفع والوتر سے مراد عاد ارم کی ھلاکت ہے- سبع لیال و ثمانیة ایام - واللیل اذا یسر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ مکرمہ کی ھجرت کی رات ہے جس سے بڑا انقلاب پیدا ہوا۔ اس انقلاب کا پروگرام کلا بل لا تکرمون الیتیم الآیہ سے شروع ہوتا ہے.

---

* دیکھو غنیۃ الطالبین۔ فصل فی التقویٰ.

94

# سُورَةُ الانْشِرَاحِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ ثَمَانُ آيَاتٍ

سورہ الانشراح مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی آٹھ آیتیں ہیں

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (۱) وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ (۲) الَّذِي أَنْقَضَ

کیا ہم نے نہیں کھول دیا تیرا سینہ اور اتار رکھا ہم نے تجھ پر سے بوجھ تیرا جس نے جھکا دی تھی

ظَهْرَكَ (۳) وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (۴) فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (۵) إِنَّ

پیٹھ تیری اور بلند کیا ہم نے مذکور تیرا سو البتہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے البتہ

مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (۶) فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ (۷) وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ (۸)

مشکل کے ساتھ آسانی ہے پھر جب تو فارغ ہو تو محنت کر اور اپنے رب کی طرف دل لگا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

# سورۃ الانشراح مکیۃ

یہ سورت مکیہ ہے۔ آپ کا دستورالعمل یہ رہا کہ آپ نے مکہ میں جماعت تیار کی اور مدینہ میں حکومت استوار کی اور حدیبیہ کے بعد **فاذا فرغت فانصب** پر عمل کیا اور بڑی جنگ چھیڑ دی تاکہ جماعت کو تن آسانی کا موقع نہ ملے اور اخیر عمر تک **و إلى ربك فارغب** پر عمل کیا۔ اللہ تعالیٰ کو ہی اپنا پروردگار سمجھا، نہ حکومت کو۔ اور پیٹ پر پتھر باندھ کرحیات مستعار کو اختتام تک پہنچایا۔
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ترقی کے جس قدر سامان تھے آن کا پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ آپ کو وہ تمام سامان دے دیے گئے۔
آیت (۱) **الم نشرح لك صدرك**: جو کام کرنا ہو آس کے متعلق جو علمی حل کر دیے جائیں وہ ایسے ہوں کہ طبیعت میں ذرا بھر بھی شبہہ نہ رہے۔ اس کو عربی میں شرح الصدر کہتے ہیں۔ وہ ایسی حالت ہوتی ہے کہ جس سے کام کا مصمم ارادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ طبیعت چاہتی ہے کہ یہ کام میں کر لوں گا۔ اس درجہ پر جب ایک نظریہ پہنچ جائے کہ انسان آسے اپنے بس کی چیز سمجھے اسے شرح الصدر کہا جاتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا گیا کہ کیا ہم نے تیرے لیے شرح الصدر نہیں دیا۔ یعنی تو اس ارادہ کو پورا کرنے کی ہمت رکھتا ہے۔ اِس قسم کی دعا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قرآن مجید میں آتی ہے۔ **رب اشرح لی صدری**۔ اسے سینے کے چیرنے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک کو چیرنے کا اِس جگہ کوئی ذکر نہیں ہے۔
اِس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کی زندگی میں آپ کے سینہ چیرنے کا ایک واقعہ ہے مگر اس کو اِس آیت کی تفسیر میں لانا زیادتی ہے۔
ہر معلم اور لیڈر کو معلوم ہے کہ جب تک اس کے دل سے تمام شکوک رفع نہ ہو جائیں اور دل میں کوئی شبہہ اس کام یا علم میں نہ رہے اور اس کام کی سرانجامی کی تمام تجویزیں سمجھ میں آجائیں اور اس کے موانع کے رفع کرنے کے طریقے سوچ لیے جائیں آس وقت تک انسان کو آس کام کے کرنے کی ہمت ہوتی ہے اور یہ ہے

شرح الصدر۔ یعنی تمام ترقی کی راہیں آپ کے دل میں آگئیں، اور پوری سمجھ سے آپ کے دل میں جاگزیں ہوئی تو بات کو آخر تک سوچ لیا اور پھر کبھی تردد شک کا موقع پیش نہیں آیا اور تمام اطمینان سے کام میں آپ اور آپ کی جماعت گئی اور سرانجام ہوگیا۔ یہ ہے شرح الصدر جس کا ذکر ہے۔

آیت (۲) و وضعنا عنك و زرك الذی انقض ظہرك :- جب انسان ایک بڑا کرنے کے لیے کھڑا ہو اور وہ اس کام کے کرنے کا مصمم ارادہ کر لے تو اس اپنے ہم خیال سچّے رفیقوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک ضرورت کے مطابق رفیق نہ ہو جائیں اس وقت تک کام اسے خود کرنے پڑتے ہیں، چھوٹے سے چھوٹا کام بڑے سے بڑا کام اسے خود کرنا پڑتا ہے۔ اور اس سے طبیعت پر اس قدر بوجھ ہے کہ یہ بوجھ کمر توڑ ڈالتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ اپنی زندگی کے ابتدائی سال میں تمام کام خود کرتے تھے۔ جس سے مقصد یہ تھا آپ کے فیصلے کی پختگی ظاہر ہو جائے۔ جب یہ درجہ طے ہوگیا اور معلوم ہوگیا آپ کسی چیز سے تھکنے والے نہیں ہیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ویسے ہی دیے جس قسم کے رفیقوں کی آپ کو ضرورت تھی۔ اِس طرح آپ کی کمر پر جو بوجھ تھا وہ ہٹ گیا۔

غرض جب رفیق جمع ہو گئے اور آپ کی پارٹی بن گئی، تو اس کے بعد کام کی تکمیل کے لیے صحیح اور عالمگیر پروپیگنڈے کی سخت ضرورت ہے۔ اسے اور دعوت کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آج کل ڈپلومیسی میں جھوٹ کا لفظ شامل کر دیا گیا ہے۔ مگر اس صحیح پروپیگنڈے میں اس جھوٹ کی مطلقاً اجازت ہے۔ اور اسے لوگوں نے خواہ مخواہ غلطی سے مشہور کر دیا ہے کہ اس میں کی اجازت ہے۔

اِس سورت کے نزول سے اول مکہ مکرمہ میں ایسی جماعت آپ نے تیار تھی جو آپ کے کام کی ذمہ دار بن گئی۔ وہ عشرہ مبشرہ اور دوسرے صحابی آنہوں نے تبلیغ اور اشاعت کے کام کو اپنے سر لے لیا اور قوت اور سمجھ سے میں لگ گئے۔ اور آئندہ یہی جماعت سلطنت اسلامیہ کی بنانے والی ہوئی۔ اس کے ہم خیال آدمی اس کام کو سب کاموں سے مقدم جانتے تھے اور اس پر مال جان دینے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔

کام کرنے کے لیے جماعت کا ہونا ضروری ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ فرماتے ہیں اگر تین ہوں تو نصاب جماعت کا پورا ہوگیا جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر صدیق رضہ اور خدیجۃ الکبریٰ یا علی رضہ یا زید جس کو بھی تیسرا سمجھا جائے۔

ہو گئے تو اب کام کرنے کے لیے کافی ہیں، کام شروع کردو۔ اور امام شافعی کہتے ہیں کہ چالیس ہوں۔ جب مدینہ منورہ میں اول جمعہ پڑھا گیا تو چالیس تھے۔ چالیس اگر جمع ہو جائیں تو تمام سیاسی کام شروع کر دینے چاہییں۔ بعض علماء کا قول ہے کہ سیاست کے لیے دس اور اشاعت مقصد کے لیے بیس اور حکومت قائم کرنے کے لیے چالیس کافی ہیں۔

آیت (۴) و رفعنا لك ذكرك: سمجھدار آدمی جب آپ کے کام کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اِس آدمی کو دیکھنا چاہیے جو اس قدر کام کر رہا ہے اور مخالف خواہ مخواہ اِس پر اتہام لگا رہے ہیں۔

آپ کا کام سمجھدار لوگوں کی نظروں میں کھُب جاتا ہے اور دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے ڈیپوٹیشن آپ کے پاس روانہ کرتے ہیں۔ اور خود ملنے کے لیے آتے ہیں۔ اور جب اُن کا اطمینان ہو جاتا ہے تو وہ خود ہی اشاعت شروع کر دیتے ہیں۔

قبل از نبوت آپ برابر قوم کو اُبھارنے اور اُن میں جو بد اخلاقیاں آگئی تھیں اُن کو دور کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے اور نہایت سرجوشی سے کام کرتے تھے۔ حلف الفضول جو عبداللہ ابن جدعان کے گھر میں منعقد ہوئی تھی۔ اُس میں آپ اور ابوبکر صدیق رضہ دونوں سرگرم ممبر تھے۔ اگرچہ اس حلف الفضول کے مقاصد ظاہر میں مختصر نظر آتے ہیں مگر اُن کے معانی بہت اعلیٰ ہیں کہ اِس شہر مکہ میں اگر کہیں ظلم ہو تو جب تک مظلوم کو حق نہ دلایا جائے تب تک ہم برابر کوشش کرتے رہیں گے خواہ اس میں ہماری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ تو یہ اصل مقصد حقیقت نبوت کا ہے۔ یعنی تمام جہان سے ظلم دور کیا جائے اور باقی چیز سب اُس کی لوازم اور مدّات میں سے ہیں۔ مگر آپ کو صحیح راستہ کی خبر نہیں تھی کہ یہ کام کس طرح ہوگا۔ تو الہام کے ذریعہ وہ راستہ اللہ تعالیٰ نے بتا دیا۔ اور رفعنا لك ذكرك کے یہ معنی بھی ہیں کہ تیرے ذکر یعنی قرآن مجید کو بلند کردیا۔ یعنی قرآن کو اقوام عالم نے قبول کر لیا، اور اس پر عمل درآمد شروع کردیا۔ یہ دوسری معنی سورت سے بہت چسپاں ہے۔

اب یوں دیکھنا چاہیے کہ یہ حلف الفضول اگرچہ چند نوجوانوں نے قائم کی ہے مگر حکیم جانتا ہے کہ قوم میں ایسا ماحول پیدا ہوگیا ہے اور ایسے افراد اِس قوم میں پیدا ہو گئے ہیں تو یہ قوم کی استعداد کا مظاہرہ ہے کہ یہ قوم نبوت کو بلا رہی ہے۔ اب جب اس میں نبی آتا ہے تو مخالفین آپ کے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہیں اور لوگوں میں آپ کے کام کی اشاعت ہوتی ہے۔ اور عرب کا سمجھدار طبقہ جانتا تھا کہ یہ وہ شخص ہے جس نے ظلم کے برخلاف ایک تحریک جاری کر رکھی تھی، اب یہ

لوگ کیوں اُس کی مذمت کرتے ہیں، تو حقیقت حال جاننے کے لیے مرکز میں آتے ہیں، آپ سے ملتے ہیں اور بات کو سمجھ جاتے ہیں۔ یہ ہے و رفعنا لك ذكرك کا مطلب۔ پروپیگنڈا خواہ مخالفت میں ہو یا موافقت میں، اس تحریک سے انسان روشناس ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ آپ کا نام تمام عرب میں شایع ہوگیا کہ یہ شخص ظلم دور کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اور اس کے ساتھ ایک سمجھدار جماعت بھی موجود ہے تو کمزور طبقہ جس کو مساکین کہا جاتا ہے، وہ مساکین آپ کو اپنا سرپرست سمجھنے لگ جاتے ہیں اور محبت کا دم بھرنے لگ جاتے ہیں اور اچھے ناموں سے آپ کو یاد کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتے ہیں کہ یا اللہ تو آپ کو نصرت و مدد دے تاکہ ہم کو ظلم سے نجات دلائیں.

آیت (۵ و ۶) فان مع العسر یسر إن مع العسر یسرا :- تنگی کے بعد آسانی آتی ہے۔ آئندہ بھی بڑا سخت کام کرو تو آسانی آجائے گی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اب آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں مگر اس سے پہلے آپ کو بہت سی مصیبتیں تھیں۔ آپ نے نہایت عالیٰ حوصلگی اور فراخ دلی سے اُن کو برداشت کیا۔ اس واسطے اللہ تعالیٰ نے آپ کے واسطے آسانی پیدا کردی۔ اب کام کو لگاتار کرنا چاہیے۔ یعنی آسانی, تنگی کے بعد آتی ہے۔ اب اس کی قدر معلوم ہوئی۔ اب بھی آئندہ آپ کو تنگی آئے گی تو آسانی اُس کے بعد آجائے گی کیوں کہ یسر تو ہے ہی عسر کے بعد.

آیت (۷) فاذا فرغت فانصب *:- آپ جب ایک کام کے ایک حصہ سے فارغ ہو گئے تو اُس کام کو جو زیادہ مشکل تھا اب شروع کیا۔ آپ نے مکہ مکرمہ میں بہت تکلیف اٹھائی تو ایک سمجھدار طبقہ نے آپ کی دعوت پر لبیک کہا یہ گویا إن مع العسر یسرا تھا۔ اور دوسری تکلیف آپ نے مدینہ منورہ میں صلح حدیبیہ کے وقت اٹھائی۔ اُس میں یہ شرط تھی کہ ہمارے قافلوں کے نگھبان تم ہو (دیکھو قصیدۂ عظمیٰ) اور قریش کے معاهدے میں بنو بکر آئے۔ اس کے سوائے تمام عرب کو قریش نے آپ کے سپرد کردیا۔ یسر کی لذت بھی عسر کے بعد ہوتی ہے۔ محنت کرنے کے بعد اُجرت کاملہ ملے تو مزدور ہمیشہ یہی چاھتا ہے کہ محنت کروں.

فانصب :- تکلیف برداشت کر۔ جس قدر مشکل حصہ ہو اُسے شروع کر۔ اس میں تجھے مشکلات بھی درپیش آئیں گی مگر تو اُن کی پروا نہ کر، کیوں کہ اس مشکل کے بعد تمام آسانیاں شروع ہو جائیں گی۔ عرب انصب الحرب اُسے کہتے ہیں جس سے شعلہ مارنے والی جنگ قائم ہو جائے.

---

* بڑی جنگ قائم کردو۔ عرب کہتا ہے انصب الحرب۔ بعد فراغت حدیبیہ جنگ شروع کر دی جائے.

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مطمح، مظالم کو دور کرنا تھا جو سرمایہ داروں نے کاشت کاروں اور غریب صناعوں پر قائم کر رکھے تھے - اور رفتہ رفتہ یہ مظالم ... صورت اختیار کر گئے تھے - بڑی دو سلطنتیں ایران اور روم بڑی مدت تک سلطنت ... کے باعث ظلم کی خوگر ہوگئی تھیں اور غرباء کی حالت حیوانوں کے مانند تھی - ... بڑے لوگ اُن سے یہ عادات سیکھ کر زیر دستوں پر ظلم کرتے تھے - تو ... تعالیٰ نے اس ظلم کو جہان سے نابود کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تاکہ انقلاب کردیں اور تمام طاقت غرباء کے ہاتھ میں آجائے، تو ... کام کی سرانجامی کے لیے عرب کی سر زمین سے جماعت تیار کرنی تھی اور اُن کو اپنے پروگرام کا پابند بنانا تھا - یہ کام بڑا مشکل تھا - جب صلح حدیبیہ ہوئی تو یہ کام سرانجام ہوگیا - پھر آپ نے مدینہ میں آکر بڑے کام کو شروع کردیا یعنی قومی کام کے بعد انٹرنیشنل کام کی ابتدا کردی - کسریٰ اور قیصر اور تمام بادشاہانِ گرد و نواح کو اطلاع کردی کہ اس پروگرام پر عمل کرو ورنہ ہماری تلوار سے بچ نہیں سکتے - ... بڑی دھمکی تھی - اِس طرح بڑے شہنشاہوں کو دھمکی دے کر کام شروع کردیا ... - معنی ہیں اِس آیت کے - اور ہر انقلابی کے لیے یہی ضروری ہوتا ہے، ورنہ اس نے جتنا اول کام کیا ہے سارے کا سارا برباد ہوجاتا ہے - سستی کرنے سے کام تباہ ہوجاتا ہے .

آیت (۸) وإلیٰ ربك فارغب :- اور اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف رغبت کر - جب انسان کے سر پر مشکل آجاتی ہے تو اُس کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے ... اس حالت میں اُس کو مناجات میں بڑی لذت آتی ہے - یعنی کام کی تکمیل کے لیے ... میں سستی نہ آئے - اور اُس کی تکمیل کے لیے انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف جھکنا چاہیے - جو لوگ انسانیت کا مکمل خاکہ ہیں، اُن کی زندگی کا اِس سورت میں ... کھینچا گیا ہے - اس سے یہ نتیجا نکالنا نہایت آسان ہے کہ تمام نوع انسانی ... پوری جامعیت میں اِس طریقہ سے ترقی کر رہی ہے - اِس خیال کو سامنے رکھنا ... نوع انسانی اپنی فطرت میں ہمیشہ ترقی کرتی ہے، اگر یہ خیال دماغ میں راسخ ہوجائے تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہر اچھا آدمی ہمیشہ ترقی کی دُھن میں لگا رہے ... - اِس واسطے کہ فرد کا کمال یہ ہے کہ اپنی نوعی خوبیوں کو زیادہ حاصل کرے - ... دو سورتوں میں فرد کامل کے حالات پیش کیے گئے ہیں تاکہ اِس نمونہ پر اچھے ... ترقی کرتے رہیں .

ہر ایک مصلح کا پہلا دعویٰ یہی ہوتا ہے کہ ہم غریبوں اور مسکینوں پر سے ... دور کرنے کے لیے محنت کر رہے ہیں - جب غرباء اُن کی یہ آواز سن کر اُن کی

امداد کرتے ہیں تو آن کی حکومت قائم ہو جاتی ہے - پھر وہ مدعی اصلاح بھی حکومت سے زیادہ ظلم کرنے لگ جانے ہیں تو اس لیے کہا گیا کہ الی ربك فارغ یعنی خدا کے لیے کام کرو - آخر حیات تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخ رضی اللہ عنہما نے حکومت کے ثمرات سے کچھ فائدہ نہیں آٹھایا بلکہ حالت مزدور جیسے رکھی اور جس طرح ہمارے ملک میں آبادکار اور مزارعین روٹی کھانے کے وقت بیٹھتے ہیں ویسے ہی آپ نے ہیئت اختیار کی - اور واسجد واقترب کا معنیٰ بھی یہی ہے -

عرب کے بہادر اور رومی بہادر لڑائی کے وقت اپنی اپنی معشوقہ حاضر کرنے کو خوب بہادری دکھاتے تو اس جگہ بھی کہا گیا کہ خدائی وصال کے لیے محنت کرکے مشقتیں برداشت کرو.

## سُورَةُ التِّينِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ ثَمَانُ آيَةٍ 95

سورہ التین مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی آٹھ آیتیں ہیں

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ (۱) وَ طُوْرِ سِيْنِيْنَ (۲) وَ هٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ (۳) لقد
قسم انجیر کی اور زیتون کی اور طور سینین کی اور اس شہر امن والے کی ہم نے
خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (۴) ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ
بنایا آدمی خوب سے اندازے پر پھر پھینک دیا اس کو نیچوں سے نیچے
اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ (۶) فَمَا يُكَذِّبُكَ
مگر جو یقین لائے اور عمل کیے اچھے سو ان کے لیے ثواب ہے اجر ہے بے انتہا پھر تو اس کے پیچھے کیوں جھٹلائے
بَعْدُ بِالدِّيْنِ (۷) اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ (۸) ع
بدلہ ملنے کو کیا نہیں اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم○

# سورۃ التین مکیۃ

قرآن مجید اساسی طور پر انسان میں دو نظریے پیدا کرنا چاہتا ہے:- (۱) ایمان
[illegible] تعالیٰ (۲) ایمان بالیوم الآخرۃ (یعنی دوسری زندگی کا یقین)- جس اِنسان میں یہ
[illegible] چیزیں فطرۃً موجود ہوں، اُس کی تعلیم کو مکمل کرنے کا ذمہ قرآن مجید
[illegible] ہے- جیسے اقلیدس کے لیے چند اصول ہیں کہ جب تک انسان کو اُن پر دست رس
[illegible] وہ اس فن کو مکمل نہیں کر سکتا- اُسے پہلے ہر قسم کے فارمولے سیکھنے
[illegible] گے تب وہ کہیں اقلیدس سیکھے گا یعنی اقلیدس میں جتنے علوم متعارفہ اور اصول
[illegible] ہیں جب تک انسان وہ یاد نہ کر لے آگے نہیں چل سکتا- اِسی طرح یہ دونوں
[illegible] ایمان باللہ و ایمان بالیوم الآخر) صحیح المزاج عقلمندوں کے لیے علوم متعارفہ کا
[illegible] رکھتے ہیں اور عام انسانیت کے لیے اصول موضوعہ کی کیفیت رکھتے ہیں (جیسے
[illegible] میں خط کا کھینچنا اور دائرہ کا بنانا).

[illegible] سورت اِس بات کو سمجھا دیتی ہے کہ یہ چیزیں انسانؐ کی فطرت میں داخل
[illegible] اِنسان کی فطرت پر ذرا سا تفصیلی اشارہ کرنا ضروری ہوگا- ہم نے شاہ
[illegible] صاحب کا جو فلسفہ پڑھا ہے اُس میں انسانیت کی تحلیل کو چار حصوں میں
[illegible] بدن انسان (۲) وہ قوت جو اِس بدن کو ہلاتی ہے اور موت کے وقت بدن
[illegible] سے خالی ہو جاتا ہے (۳) وہ علمی نور جس کو ملکیت سے تعبیر کیا جاتا ہے
[illegible] وہ محبت الٰہی کا جذبہ جو ایک موتی کی شکل میں انسانی طبیعت میں موجود
[illegible] اِس سورت کی شرح میں چار قسمیں بیان کی گئی ہیں.

[illegible] (۱) والتین و زیتون:- تین اور زیتون ایک قسم کے پھل ہیں یعنی میوے
[illegible] بعض اہل علم اِس سے مسجدیں مراد لیتے ہیں مگر ہماری رائے اس کے موافق نہیں- تین
[illegible] ہم جسم انسانی کی طرف اشارہ سمجھ رہے ہیں اور زیتون سے وہ روح ہوائی مراد
[illegible] ہیں جو اس بدن کو چلاتی ہے- جیسے زیتون کے ہر ذرہ کے اندر تیل ملا ہوا
[illegible] اسی طرح وہ روح، اِنسان کے ذرہ ذرہ میں پیوستہ ہے.

[illegible] (۲) و طور سینین:- طور سینا پر تجلّی الٰہی ظاہر ہوئی- حضرت موسیٰ

علیہ السلام نے آسے دیکھا۔ اِس سے انسانیت میں وہ مَلَکی شان مراد لیتے ہیں جس
انسان حکومتیں بناتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جو آسے عام حیوانات سے ممتاز کر دیتی ہے
اِسے ہم مَلَکی روح سمجھتے ہیں۔

آیت (۳) **و ھذا البلد الامین**:- اور امانت والے شہر مکہ کی قسم۔ یہ شہر
خدا دوست لوگوں کا مرکز رہا ہے۔ ایسا کہنا چاہیے کہ یہ عاشقان الٰہی کی
ہے۔ اِس سے ہم آس روحانی جوہر کی طرف اشارہ مراد لیتے ہیں جو اللہ کی طرف
کرتی ہے اور جس کا نام روح الٰہی رکھا جاتا ہے۔

آیت (۴) **لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم**:- غرض یہ چاروں چیزیں گواہ
کہ ہم نے انسان کو بہترین ترکیب میں پیدا کیا۔ ایک مرکب کی خوبی پر
کے اجزاء کی خوبی سے استدلال کیا جا سکتا ہے۔

جب کہ انسان کے یہ چار اجزاء بہت قیمتی ہیں تو ان کی ترکیب سے جو انسان
پیدا ہوا وہ اعلیٰ، عمدہ اور احسن پیدا ہو گا۔

آیت (۵) **ثم رددناہ اسفل سافلین**:- پھر ہم نے آس کو زیادہ محتاج بنا
بدن کی وجہ سے زمین پر جس قدر چیزیں ہیں اِنسان آن کا محتاج ہے۔ یعنی انسان
سب سے زیادہ محتاج بنا دیا۔ روح ہوائی کی وجہ سے انسان تمام چیزوں کا محتاج ہے
اسی طرح اعلیٰ درجہ کی جو مَلَکی قوتیں ہیں، اپنی مَلَکیت کے لیے ان کا بھی
محتاج ہے۔ آخر اِس جوہر (روح الٰہی) کی حفاظت کے لیے انسان اللہ تعالیٰ کی
عنایت کا محتاج ہے۔ تو جیسا کہ کہا گیا ہے کہ:- "آناں کہ غنی ترند محتاج تر
یہ جس قدر بہتر صفات کا مالک تھا، آتنا ہی زیادہ نیچے آترتا گیا۔ یعنی چونکہ
کو سب چیزوں کی احتیاج تھی اس لیے سب کائنات سے زیادہ محتاج ہوتا گیا۔
بہت لوگ فقط بدن کی احتیاج رفع کرنے میں لگ کر اور چیزوں کو بھول بیٹھے
نفس کے گڑھے میں گر گئے، تو اب اس کی عزت برقرار رکھنے کے لیے ہم نے قانون

آیت (۶) **الا الذین آمنو و عملوا الصالحات فلھم اجر غیر ممنون**:- یعنی اب اگر
اپنی عزت قائم رکھنا چاہتا ہے۔ جیسا کہ خود بہترین اجزاء سے مرکب ہو کر
اعلیٰ درجہ کا انسان بنا۔ اگر اس عزت کو سمجھنا چاہتا ہے (جو اس کا قطری
ہے) اور اپنی ضرورتیں بھی پیدا کرنا چاہتا ہے تو آسے چاہیے کہ اعلیٰ درجہ کے
فرشتوں سے خاص تعلق پیدا کر لے۔ اِس واسطے فرمایا کہ آن کے واسطے اجر بے
ہے۔ یعنی وہ فرشتوں کے مانند ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے تعلق خاص پیدا کر لے۔
لوگوں نے اللہ تعالیٰ سے تعلق ٹھیک کر لیا، آن کی تمام ضرورتیں ہمیشہ پوری
رھیں گی اور وہ اپنی شان قائم رکھ سکتے ہیں۔ کیوں کہ جب انھوں نے تمام اجزاء

[illegible] کی تو پہلا جو نظریہ تھا (ایمان باللہ) وہ تو اس کی فطرت کے لوازم سے ہوگیا۔ [illegible] میں روح الٰہی کا جزء موجود تھا اور اس کی طبعی کشش اللہ تعالیٰ کی طرف تھی [illegible] ایمان باللہ اس کے لوازمِ فطریہ میں سے ہوگیا۔

آیت (۷) فمایکذبك بعد بالدین :- خدا کو تو مان لیا، اب یوم الدین سے انکار [illegible] کی کون سی چیز باعث بنتی ہے؟

آیت (۸) الیس اللہ باحکم الحاکمین :- کیا اللہ تعالیٰ تمام حاکموں کا بڑا حاکم [illegible] ہے کہ اس کے پاس اپیل نہیں ہونی چاہیے؟

[illegible] دوسری بات (ایمان بالیوم الآخر) رہی، تو یوں سمجھنا چاہیے کہ چھوٹے [illegible] کے فیصلے میں اگر غلطی ہو جائے تو بڑے حاکم کے ہاں اپیل ہو سکتی ہے [illegible] بڑا حاکم اس غلطی کو درست کر دیتا ہے، اور جو فیصلہ ٹھیک ہوتا ہے اسے [illegible] قائم رہنے دیتا ہے۔ تو اِس سلسلے میں انسان اگر غور کرے تو دنیا میں جس [illegible] آخری فیصلہ کن طاقت پیدا ہو سکتی ہے، اس کے (آخری فیصلہ) میں بھی غلطیاں [illegible] رہیں گی۔ اُن کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ کو احکم الحاکمین مان لینا انسانی [illegible] کا طبعی تقاضا ہوگا کہ وہ سب حاکموں کا حاکم ہے۔

اس واسطے کہا کہ کیا اس کے پاس اپیل کرنے کے لیے دماغ میں گنجائش پیدا [illegible] کی جائے گی؟ ضرور ہونی چاہیے۔ اس کا نام یوم الدین ہے۔ یہ بھی انسان کے فطری [illegible] میں داخل ہے۔ اور دنیا کے جبار حاکموں کے خلاف اپیل وہاں ہوگی۔

جب ایسے قیمتی اجزاء سے انسان کو مرکب کیا اور اس میں اتنی اعلیٰ قوتیں [illegible] تو اب اگر کوئی شخص ایسے احکم الحاکمین کی امانت اور ودیعت کو ضایع [illegible] یا اس کو بے جا خرچ کرے، یا اس کی قدر و قیمت نہ پہچانے، تو کیا [illegible] تعالیٰ احکم الحاکمین نہیں ہے؟ ادنیٰ حاکم کی کوئی شخص خیانت کرے تو وہ [illegible] کو اپنی حکومت کی حیثیت سے سزا دیتا ہے اور تم کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ [illegible] الحاکمین ہے، پھر تو سزا بھی سخت ہوگی۔ جو چیزیں تم میں اس نے ودیعت [illegible] تھیں ضرور ایک دن ایسا آنا چاہیے کہ وہ اس ودیعت کو دیکھے اور جس نے [illegible] کو اعلیٰ طریقہ سے استعمال کیا اس کو اچھا بدلہ دے اور جس نے اس کو خراب [illegible] اس کو سخت سزا دے۔

# سورة العلق مكية وهي تسع عشرة آية

سورہ علق مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی انیس آیتیں ہیں

96

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ (۱) خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ (۲) اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ

پڑھ اپنے رب کے نام سے جو سب کا بنانے والا، بنایا آدمی کو جمے ہوئے لہو سے، پڑھ اور تیرا رب

الْاَكْرَمُ (۳) الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (۴) عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (۵) كَلَّآ اِنَّ

بڑا کریم ہے جس نے علم سکھایا قلم سے، سکھلایا آدمی کو جو وہ نہ جانتا تھا کوئی نہیں

الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى (۶) اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى (۷) اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى (۸)

آدمی سر چڑھتا ہے اس سے کہ دیکھے اپنے آپ کو بے پروا، بے شک تیرے رب کی طرف پھر جانا ہے

اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يَنْهٰى (۹) عَبْدًا اِذَا صَلّٰى (۱۰) اَرَءَيْتَ اِنْ كَانَ

تو نے دیکھا اس کو جو منع کرتا ہے ایک بندہ کو جب وہ نماز پڑھے بھلا دیکھ تو اگر ہوتا

عَلَى الْهُدٰٓى (۱۱) اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى (۱۲) اَرَءَيْتَ اِنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى (۱۳)

نیک راہ پر یا سکھلاتا ڈر کے کام بھلا دیکھ تو اگر جھٹلایا اور منہ موڑا

اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى (۱۴) كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۵ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ (۱۵)

یہ نہ جانا کہ اللہ دیکھتا ہے کوئی نہیں اگر باز نہ آئے گا ہم گھسیٹیں گے چوٹی پکڑ کر

بسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیمِ O

# سورة العلق مکیة

(یہ سورة آزادیِ عالم کا نسخہ ہے)

قرآن مجید کے نظریات بیان کیے گئے ہیں۔ اور اب فقط نتیجہ نکالنا ہی باقی رہ گیا ہے۔ اب اِس فصل میں نتیجہ نکالا جائے گا۔ یعنی اب اِس فصل میں قرآن مجید کے تمام خلاصہ کو بیان کیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں یہ سورت العلق سب سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ اِس سورت سے پہلے جس قدر قرآن ہے اور اس میں جس قدر تعلیم دی گئی ہے اُس تمام تعلیم کو اب کتاب کے آخر میں درج کر دیا گیا ہے۔ اس لیے ہم اِس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ بطور نتیجہ کے دعویٰ کا اعادہ ہے۔

قرآن مجید انسانیت سے بحث کرتا ہے تو انسانیت کو اس علم کا موضوع کہا جائے گا۔ موضوع کا مقرر کرنا اور اس کی جنس و فصل بیان کر کے اس کی تعریف کرنی ضروری ہے اور دوسری بحث ہے قرآن مجید میں الہام کی۔ تو الہام کی تعریف، اس کے فوائد اور اُس کی طرف انسانیت کا احتیاج بیان کرنا بھی ضروری ہے۔ اِس پہلی سورت میں دونوں باتیں نہایت واضح طریقہ سے بیان کی گئی ہیں۔

آیت(۱ تا ۵) اقرء باسم ربك الذی خلق، خلق الانسان من علق الآیات:۔ اِس سورت کی پہلی پانچ آیات اکٹھی نازل ہوئیں۔ یہ پانچوں آیات، انسانیت اور الہام کی تفسیر ہیں۔ شریعت الٰہی میں انسانیت کے احوال سے بحث کی جاتی ہے اور جس چیز کے احوال سے علم میں بحث ہو اس چیز کو علمی اصطلاح میں موضوع علم کہا جاتا ہے۔

آیت (۱) اقرء باسم ربك الذی خلق *:۔ جس اللہ نے پیدا کیا ہے اُس کا نام لے کر پڑھنا شروع کر۔ جو چیز کائنات میں سے ہے اُس کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ اور اِس بارے میں تمام انسانیت متفق ہے اور اس میں کوئی جھگڑا نہیں ہے:۔

---

* تربیت کا مادہ تعلیم سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک شی سے دوسری شی تیار کرنے کی قوت بھی تعلیم سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ خوبی تعلیم کی ہے۔

نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ (۱۶) فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ (۱۷) سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ (۱۸) كَلَّا

کیسی چوٹی جھوٹی گنہگار اب بلالیوے اپنے مجلس والوں کو ہم بھی بلاتے ہیں پیادے سیاست کرنے

لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (۱۹)

کوئی نہیں، مت مان اُس کا کہا اور سجدہ کر اور نزدیک ہو

السجدة

(۱) انسانیت کا وہ حصہ جو کسی نہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہے [illegible] ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو عام مخلوقات کا پیدا کرنے والا مانتا ہے. (۲) ترقی [illegible] انسانیت کا جو حصہ مذہب سے تعلق نہیں رکھتا اور عقلی فلسفے کا قائل ہے [illegible] بالاتفاق اِس تمام کائنات کا ایک مرکز متعین کرتے ہیں کہ جس سے تمام وجود [illegible] ظاہر ہوا، اور اُسی کو تمام چیزوں کا خالق کہتے ہیں۔ اِس سے آگے اگر [illegible] سے یہ بیان کیا جائے کہ خلق کس طرح پیدا ہوئی تو اس میں (۱) اور (۲) [illegible] کچھ اختلافات ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فلسفیوں کے مختلف مسالک ہیں کہ [illegible] اور مادہ کس طرح بڑھے وغیرہ۔ مگر اس میں شک نہیں کہ تمام انسانیت کا [illegible] ایک ہے اور یہ تمام چیزیں اس مرکز سے پیدا ہوئی ہیں۔ اس میں کسی کو [illegible] نہیں اور مذکورہ بالا دونوں جماعتیں اس پر متفق ہیں.

بعض لوگوں کو شوق ہوتا ہے کہ وہ لوگوں میں اختلاف دکھلائیں کہ [illegible] میں بہت بڑا اختلاف ہے۔ وہ جہاں دیکھتے ہیں کہ کسی حکیم نے مادہ سے [illegible] کو پھیلانے کی صورت اختیار کی ہے اور یہ کہ اِس باب میں وہ حکیم اپنے پیدا [illegible] والے (اللہ) کا نام نہیں لیتا تو وہ فوراً کہہ دیتے ہیں کہ فلاں حکیم اللہ تعالیٰ [illegible] نہیں مانتا۔ یہ اُن لوگوں کی کوتاہ نظری ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان [illegible] نے ان فلسفیوں کے مذہب کا اچھی طرح سے مطالعہ نہیں کیا. بہرحال تمام [illegible] اِسی بات پر متفق ہے کہ تمام کائنات کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا، تو اِس واسطے [illegible] رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تو بھی اُسی کا نام لے کر پڑھ.

آیت (۲) خلق الانسان من علق* :- اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا۔ [illegible] انسانیت کی بحث شروع ہوگئی)۔ انسان جب تک انسانیت کو نہ سمجھے وہ [illegible]

* تعلیم کے بغیر تو انسان ایک علق ہے.

کو نہیں سمجھ سکتا۔ انسان کا ایک حصہ ہے بدن، اور گوشت کے ٹکڑے سے
کو پیدا کیا۔ اب وہ گوشت کا ٹکڑا کب پیدا ہوا؛ اِس پر اِس جگہ بحث
ہے۔ مادّیات کے خلاصہ میں سے خلاصہ نکلتا ہوا گوشت کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے۔
سے انسان پیدا کیا جاتا ہے۔ تو انسان بھی عام مخلوقات میں شریک ہوا اور
اس جنس کا ایک نوعی فرد ہے۔ تو جیسے تمام مخلوقات کا تعلق اپنے خالق
سے ان کا تعلق بھی ثابت ہوا اور اگر خلق میں عام مخلوقات کا بیان کر کے پھر
کی خلقت بیان کرنے سے یہ بات ثابت ہے کہ تمام مخلوقات کا خلاصہ در خلاصہ
ہے تو یہ اشرف المخلوقات ہوا، اور اس کی ذمہ داری بڑھ گئی۔

آیت (۳ تا ۵) اقرء و ربك الاكرم الذی علم بالقلم، علم الانسان ما لم یعلم* :-
کو پیدا کرنا یہ کرم تھا۔ اور اُس کو عالم بنانا اور تمام انواع کے علم کا
جمع کر دینا یہ اُس کے کرم میں ایک اضافہ ہے۔ انسان اجتماعیت سے ترقی
ہے اور اجتماعی علم قلم سے محفوظ رہتا ہے۔ پہلے لوگوں نے جو کچھ کیا
تجربات اور اپنی تاریخ قلم بند کر دی۔ اس کے بعد جو دوسری قوم آئی اُس نے
تحقیقات اور تاریخی باتوں سے فائدہ اٹھایا اور اِس طرح اپنی تاریخ بھی قلم بند
۔ تو انسان میں قلم (نوشت و خواند) سے علمی اجتماع پیدا ہوتا ہے۔

آیت (۵) و علم الانسان ما لم یعلم :- اب آئندہ کے واسطے جن چیزوں کو انسان
تھا ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم دیا۔ قلم کا استعمال نہ
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم ہی کچھ زیادہ
تھی۔ تو اب انسانیت کا تمام علم جو ترقی پر پہنچ چکا ہے، اگر رسول کریم
علیہ وسلم کو سکھانا منظور ہو تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوائے کوئی نہیں
سکے گا۔ اللہ تعالیٰ کے کرم کا ایک تو یہ اثر ہے کہ جس قوم میں قلم کا
محفوظ ہے وہ لوگ کتابیں پڑھ کر عالم ہو جاتے ہیں اور جس قوم میں یہ
نہیں ہے اُس کو اللہ تعالیٰ اور طریقہ سے تعلیم دیتا ہے۔ اب یہ واقعہ ہے کہ اور
(قلم کے سوائے) جس سے علم دیا جاتا ہے وہ حظیرۃ القدس سے اتصال ہے۔
کرام کی اصطلاح میں کہا جاتا ہے کہ جس فرشتہ کے ذریعہ سے انسان کو

---

اقرء میں پرائمری تعلیم تھی۔ اب اعلیٰ تعلیم کے لیے کہا جاتا ہے۔ اعلیٰ
سے بڑی عزت اور سخاوت انسان کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔ لوگوں کو تربیت
والے کی لوگ عزت کرتے ہیں اور علم کا خاصہ سخاوت، جوان مردی اور
عالی ہے۔ علم بالقلم :- اب علم کی تقسیم کی جاتی ہے ایک پرانا نوشتہ اور
دوسرا علم الہامی جو نبوت کے ذریعہ نازل ہوتا ہے۔

حظیرۃالقدس میں سے علم ملتا ہے اس فرشتہ کو قلم اعلیٰ کہا جاتا ہے۔ اب قلم کو ہم یہاں عام طور پر لے لیتے ہیں کہ وہ زمین کا قلم ہو یا حظیرۃالقدس کا قلم ہو۔

اِن آیات کا خلاصہ یہ نکلا کہ انسان ایک حیوان ہے اور وہ علم اجتماعی رکھتا ہے اور وہ علم میں ترقی کر سکتا ہے اور آلات کا استعمال کرتا ہے۔ منطق میں انسان کی دو تعریف بیان کرتے ہیں ایک تو حیوان ناطق اور دوسری تعریف ہے **حیوان یستعمل الآلات** یعنی اپنے تمام کاموں میں آلات کا استعمال کرتا ہے۔ ایک علم تو اُس نے قلم کے ذریعہ حاصل کیا جس کو زمین کا قلم کہا جاتا ہے اور دوسرا علم اُس کا قلم اعلیٰ سے حاصل ہوا، پھر اُس کو قلم کے ذریعہ جہاں میں پھیلایا۔ خود بھی مستفید ہوا اور دوسرے کے افادہ کے لیے اُس کو عام کر دیا۔ یہ خاصیت انسان کی ہے۔ قلم سے جو علوم اور تاریخ لکھی جاتی ہے اُس میں بہت غلط باتیں ۔لکھی جاتی ہیں۔ اس کے باعث ان علوم سے اتنا فائدہ نہیں ہوتا اور بہت مشکلات درپیش آجاتی ہیں اور غلط در غلط تاویل سے انسان کا دماغ چکرا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے وہ تمام عقدے انسانیت کے لیے وحی کے ذریعہ دور کرتا ہے اور ترقی کے راستہ میں جتنے غلط نظریے یا نتائج اعمال، رکاوٹ ڈال رہے تھے الہام کے ذیعے وہ رکاوٹیں دور کر دی جاتی ہیں۔ آیندہ پروگرام اُس کو غیر مبدل دیا جاتا ہے جس کو انسانی فطرت اپنا سمجھ کر قبول کر لیتی ہے اور ایسی نعمت الٰہی کا کوئی شخص منکر نہیں ہو سکتا۔ چونکہ ایسی باتیں انسانی عقلی سے بالا تھیں تو اُس کو ایسا علم حظیرۃالقدس سے دیا گیا جس سے اُس کی تمام مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔

الہام کی ضرورت اِس لیے ہوئی کہ قلم کے لکھے ہوئے علم میں خلط ملط سے جو عقدہ پڑ جاتا ہے اس کے حل کرنے کے لیے ہی الہام کی ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ یہ مشکلات ایسی تھیں کہ عقل انسانی اس کے حل کرنے سے قاصر تھی اِلاّ بعد بہت تجربہ کے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم اور عنایت سے انسان کو سہل راستہ دکھایا (الہام سے)۔ اب یہ آخری الہام جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونا شروع ہوتا ہے ایسا محفوظ کر دیا جائے گا کہ اس میں غلط بات کا خلط ہرگز نہ ہو گا۔ اِس لیے آئندہ کسی نبی کے آنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اس کے سمجھنے کے لیے عقل کفایت کرتی رہے گی۔

اب جب الہامی علم کی اتنی ضرورت محسوس ہوئی اور مطلق علم بھی انسانی ترقی کے لیے مفید اور سخت ضروری ہوا تو علم کی دشمنی کرنا کسی کے ذہن میں نہیں آتی اور مفید شیٔ کے لیے ہر ایک سخت کوشش کرتا ہے۔ مگر سرمایہ دار ہمیشہ چاہتا ہے کہ سوسائٹی کا اجماع میرا محتاج رہے اور اُن کو میری خفیہ تدبیروں کا علم نہ ہو اِس لیے علم کی اشاعت سے وہ لوگوں کو روکتا ہے۔ کبھی کوئی سرمایہ دار

کے زیردستوں کو علم سے مانوس نہیں ہونے دیتا۔ اب آئندہ آیات میں یہ بیان کیا جاتا ہے۔

آیت (۶ تا ۱۴) اب دوسری فصل شروع ہوتی ہے۔ اس میں انسانیت کی تقسیم دو حصوں میں کر دی جاتی ہے (تعریف کے بعد تقسیم ہوتی ہے)۔ ایک انسان ہے کہ جو انسانیت کے حدود چھوڑ دیتا ہے۔ اور دوسرا انسان ہے کہ انسانیت کے حدود پر اور اس کے مقتضا پر پوری پوری طرح کاربند ہے۔ اور وہ علم جو مقتضی انسانیت میں سے تھا اس کی اشاعت کرتا ہے اور دوسرا اُس کو روکتا ہے۔ چنانچہ اس کا سبب بتلایا جاتا ہے کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے اور صحیح علم جو صحیح تمدن کی لیے نہایت ضروری ہے اس کی مخالفت کیوں کرتا ہے۔ اس کا سبب بتایا جاتا ہے۔

آیت (۶ و ۷) کلا إن الانسان لیطغیٰ* ان رآہ إستغنیٰ :- اس کا سبب یہ ہے کہ جس کے پاس جب روپیہ جمع ہوتا ہے وہ انسانیت کی حد سے نکلنے لگتا ہے۔ اور اپنی جماعت سے مستغنی ہو جاتا ہے اور اپنی حدود چھوڑنے لگ جاتا ہے۔

اس سے یہ اشارہ سمجھ میں آتا ہے کہ انسان جماعت کے اندر رہے تو اس کی انسانیت ٹھیک رہتی ہے۔ بعض چیزوں میں وہ دوسروں کا محتاج ہے اور بعض میں دوسرے لوگ اس کے محتاج ہیں۔ اِسی طرح سوسائٹی میں برابری کا خیال محفوظ و ملحوظ رہتا ہے کہ لوگ اُس کے محتاج ہیں اور یہ لوگوں کا محتاج ہے۔ اور جب اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ میں اِنسانی سوسائٹی میں لوگوں کا محتاج نہیں ہوں تو وہ اپنی حد سے بڑھنے لگا۔ غرض اللہ تعالیٰ نے اپنا قانون ایسا بنایا ہے کہ کوئی فرد اپنی نوع سے باہر جا ہی نہیں سکتا۔

کلا :- ہرگز نہیں یعنی یہ خیال کرنا کہ تمام انسان اعلیٰ علوم کی اشاعت اور انسانیت اور تمدن کے لیے علم کے برکات سے مستفید ہونا چاہتے ہیں، ایسا نہیں ہے۔ بلکہ بعض انسان طاغی ہوتے ہیں اور لوگوں پر ظلم کرنا چاہتے ہیں۔ اِس لیے انسانوں میں فہم اور علم پیدا ہونے نہیں دیتے اور اس کا سبب فقط استغنا ہے یعنی سرمایہ داری ہے۔ سرمایہ دار طبقہ مساکین پر ظلم جاری رکھنے کے لیے اُن کو علم سے آشنا نہیں ہونے دیتے۔

---

* تعلیم سے روکنے والا طاغی انسان ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ غرباء غلامی کی زنجیر میں جکڑے رہیں۔ دوسروں کو اپنا محتاج بناتا ہے۔ یہ سرمایہ پرستوں کی عادت قبیحہ ہے۔ وہ جبری تعلیم کی مخالفت کرتے ہیں۔ إقرأ امر ہے، فرض عینی ہے۔ یہ تعلیم ہی ایسا نسخہ ہے جس سے غلامی کی زنجیریں کٹ جاتی ہیں اور انسان ترقی کے راستے دیکھنے لگتا ہے۔ سرمایہ پرست انسان پڑھنے لکھنے سے لوگوں کو روکتا ہے تاکہ وہ غلامی میں رہیں۔

آیت (۸) إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَىٰ :- تیرے رب کی طرف رجوع ہونا ہے۔ یعنی ہر
ایک محتاج ہے اور اس کا رخ حظیرۃ القدس کی طرف ہے۔ جہاں شخصِ اکبر موجود ہے
اور تجلی الٰہی بھی موجود ہے۔ یعنی ہر ایک انسان کو ہم نے اپنا محتاج بنا
ہے تو اس کا اثر یہ ہوا کہ ہر ایک دوسرے کا محتاج ہے اور یہ احتیاج اُس کی صورت
نوعیہ کا تقاضا ہے۔ اور ہر ایک کو دوسرے کا مساوی احتیاج ہے اور مستغنی فقط
اللہ تعالیٰ ہے، اُس سے سب مانگ رہے ہیں تو انسان پر واجب تھا کہ وہ اپنی حیثیت
پر غور کرتا اور جانتا کہ :-

آنان کہ غنی تراند محتاج تراند    واللہ ھوالغنی و انتم الفقراء

آیت (۹ و ۱۰) أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَىٰ عَبْدًا إِذَا صَلَّىٰ :- اب اِس سلسلہ میں انسانیت
کے دوسرے فریق (طاغی) کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ حد سے گذرنے والے انسان کی مثال
دی جاتی ہے اور اِسی ضمن میں انسانیت کے دوسرے طبقہ کا ذکر آ جاتا ہے۔

ایک بندہ جب اللہ تعالیٰ کا نام لیتا (نماز پڑھتا) شروع کرے تو اُسے منع کرتا
ہے۔ وہ جو اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے اور نماز پڑھتا ہے تو اس کا اتصال اپنے رب
سے ہوا اس لیے وہ ضرور اُس کے بندوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھے گا اور ہر
مظلوم کی داد رسی کرنے میں سعی کرے گا، لوگ اُس کے پاس جمع ہو جائے گے
کیوں کہ وہ محتاجوں اور مسکینوں کا مددگار ثابت ہوتا ہے اور ان محتاجوں، مسکینوں
اور مظلوموں کو یقین ہے کہ یہ شخص ہم کو ظلم سے نجات دلائے گا اور وہ
نمازی اُن کو تسلی دیتا اور بشارت دیتا ہے۔ مگر جو آدمی انسانیت کی حدود سے
جائے (ظالم ہو جائے) وہ اِس بات کو برداشت نہیں کر سکتا، کیوں کہ اُسے خطرہ
ہے کہ اس طرح پر وہ کسی پر ظلم نہیں کر سکے گا۔ وہ برداشت نہیں کر سکتا
کہ اس نمازی کے پاس چار آدمی جمع ہوں۔ لہٰذا وہ نمازی آدمی کو نماز پڑھنے سے
بھی منع کرتا ہے کہ اِس نماز کی باعث لوگ ایسے ظالموں سے متنفر ہو جائیں گے
یعنی نماز میں قرآن شریف پڑھا جاتا ہے جس میں عدالت قائم کرنا اور عدالت کی
فضیلت اور ظالموں، فاسقوں پر لعنت ملامت ہے اور اعمال صالحہ یعنی عدالت قائم
کرنے والے مسکینوں اور محتاجوں کو، اور انصاف کرنے والوں اور محتاجوں کے کھانے
کا انتظام کرنے والوں کے لیے بشارت اور ہمت افزائی ہے۔ تو در اصل وہ قرآن مجید
پڑھنے سے منع کر رہا ہے اور قرآن مجید کی تعلیم کو روکتا ہے۔ کیوں کہ اُس کو
خوف ہے کہ اِس سے لوگوں میں بیداری پیدا ہو جائے گی تو پھر وہ کسی پر ظلم
نہیں کر سکے گا۔

قرآن مجید کی تلاوت اور دَور کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ نماز میں پڑھا جائے

صلواۃ اور قرآن مجید کی تلاوت آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ کبھی آپس میں جدا نہیں ہوتے۔

آیت (۱۱ و ۱۲) **ارءیت إن كان على الهدىٰ او امر بالتقوىٰ** :- اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے خاص بندے کا ذکر ہے۔ ترجمہ آیت (۱۱) :- اگر وہ آدمی سیدھے راستہ پر ہو تو کسی کو کیا حق ہے کہ اُسے منع کرے؟ اُس کو روکنا درحقیقت صریح ظلم ہے۔

آیت (۱۲) وہ لوگوں کو انصاف کا حکم دیتا ہے تو کیا اُس کو کوئی روک سکتا ہے؟ ہرگز کوئی نہیں روک سکتا۔ اُس کو روکنے کا مطلب تو یہی ہوگا کہ انسانیت پر ظلم ہوتا ہے۔

اِن آیات (۹ تا ۱۲) تک اشارہ اس طرف ہے کہ اگر کوئی طاغی اور ظالم اُس کا مقابلہ کرے تو اولاً اُس کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا ایک ذلیل بندہ سمجھے اور جو صحیح تعلیم ہے اُس پر کاربند رہے اور انصاف قائم کرنے میں کوشش کرے۔ پھر انسانیت کے اچھے افراد اُس کی جماعت میں شامل ہو کر اُس ظالم اور اُس کے ظلم کی بیخ کنی کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ اُس کو خوب دیکھتا ہے اور وہ اس کو ترقی دیتا رہے گا۔ ہر بات میں آگے بڑھنا چاہیے یعنی جو صحیح تعلیم اُس نے شروع کی ہے اُس کی تکمیل کے لیے آگے بڑھنا چاہیے اور اس سبقت سے وہ میدان جیت لے گا۔

عام مفسرین نے یہ خیال بنا رکھا ہے کہ وہ طاغی، خدا کو یاد کرنے سے روکتا ہے اِس لیے یہ ظلم ہے، حالانکہ اِس طرح نہیں ہے۔ اصل میں نمازی اپنی نماز میں قرآن شریف پڑھتا ہے اور قرآن مجید کی تعلیم کی اشاعت کرتا ہے اور قرآن مجید کا وعظ کرتا ہے جس میں انصاف کرنا انسانیت کے لیے ضروری بتایا جاتا ہے۔ اِسی لیے مسکین، محتاج اور مظلوم اُس کے پاس جمع ہو جاتے ہیں اور ظلم دور کرنے کے لیے اُس کی جماعت میں شامل ہو جاتے ہیں تو سرمایہ دار سے جھگڑا پیدا ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس طرح ظالم برباد ہوتا ہے اور اُس کی سلطنت اور سرمایہ تمام ہاتھ سے جاتے ہیں۔ اس سے اُس پر زد پڑتی ہے۔ کیوں کہ جب انصاف قائم ہو گیا تو اُس کی کوئی سلطنت ہی نہیں رہے گی۔ انصاف قائم کرنا اور لوگوں پر سے ظلم دور کرنا قرآن مجید کی تعلیم کی روح و رواں ہے۔ اور خدا کو یاد کرنے والا آدمی لوگوں کو کہتا ہے کہ انسانیت سوائے انصاف قائم کرنے کے کبھی ترقی کر ہی نہیں سکتی۔ آیت (۱۳) **ارءیت ان كذب و تولىٰ** : اور یہ ظالم اُس کو جھٹلاتا ہے اور انسانیت کو ترقی کرنے سے روکتا ہے۔ یعنی ترقی کی طرف پشت کر رہا ہے اور رجعت پسندی اختیار کر رہا

ہے اور لوگوں کو بھی پیچھے لے جا رہا ہے۔ رات دن اُس کی بھی کوشش
کہ اس دعویٰ کو (کہ انسانیت انصاف کے سوائے ترقی نہیں کر سکتی اور
سے ظلم دور کرنا انسانیت کا فرض ہے) جھوٹا ثابت کرے۔ یہ معنی ہے کذب
اور جب اُس کے پاس کوئی برہان اور دلیل نہیں رہتی اور وہ عاجز ہو جاتا ہے
لڑنے کی تیاری کرتا ہے یہ معنیٰ ہے و تولی کا۔

آیت (۱۴) الم یعلم بان اللہ یریٰ :- اس طاغی کو اتنی بھی سمجھ نہیں
اس کے کام کو اور اُس بندۂ نمازی کے کام کو خدا دیکھ رہا ہے۔ اور کیا یہ
بھی نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ اس انصاف قائم کرنے والے بندے کو کامیاب کر
ہے۔ کیا یہ طاغی اُس کو نہیں سمجھتا ؟

شروع سورۃ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے بنایا اور
فطرت دی۔ اب اگر کوئی آدمی اس فطرت کے خلاف کام کرے گا تو اللہ تعالیٰ
توڑ کر رکھ دے گا۔ کیا یہ اُس کو نہیں جانتا ؟ غرض اِس سورۃ میں یہ بات
کر دی گئی کہ انسانیت دو جماعتیں ہو کر کام کرتی ہے۔ آگے جنگ شروع ہوتی ہے

اب تیسری فصل شروع ہوتی ہے کہ اب جب کہ یہ نزاع شروع ہو گیا کہ
بات کو نہیں سنتے تو ان میں ہاتھا پائی ہونی ضروری ہے) :-

آیت (۱۵ و ۱۶) کلا لئن لم ینتہ ○ لنسفعاً بالناصیۃ ○ ناصیۃ کاذبۃ خاطئۃ :-
یہ آدمی اپنی حرکت سے باز نہ آیا تو ہم اُسے بالوں سے پکڑیں گے۔ کلا یعنی یہ
کرنا کہ یہ ایسا کرتا رہے گا اور یہ چونکہ سرمایہ دار ہے اُس کو کوئی اپنے کام سے
روک نہیں سکتا، یہ غلط ہے۔ بلکہ اگر یہ شخص اپنی غلط روی پر قائم رہا
عدالت اور انصاف کرنے سے روکتا رہا تو اُس کو پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر
زمین پر مار دیا جائے گا۔ یعنی اُن کو نہایت ذلیل کر دیا جائے گا۔ وہ پیشانی
بال تو پاکیزہ لوگوں کی طرح رکھتا ہے مگر باطن میں بڑا شیطان، جھوٹا اور خطا
ہے کہ وہ حق کا مقابلہ کرتا ہے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں پیشانی کے بال مقدس سمجھے جاتے تھے جیسے
سکھوں کے ہاں کیس اور ہندوؤں کے یہاں بودی رکھنی۔ اہل عرب بال رکھتے
نہایت عزت سے اُن کی پرورش کرتے اور پھر اُن کو حج کے ایام میں مقام منیٰ میں
منڈواتے تھے۔ اور یہ منڈوانا سر کٹانے کے برابر سمجھا جاتا تھا۔

قریش مکہ یعنی مخالفین اسلام کے بہت سے آدمی بدر کی جنگ میں مارے گئے
اور انہیں اُن کی پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر کنویں میں ڈال دیا گیا۔

آیت (۱۷) فلیدع نادیہ *:- وہ اپنی مجلس کے ہم نشینوں کو اپنی مدد کے لیے
بلائے جو اس کے شریک کار ہیں.
آیت (۱۸) سندع الزبانیۃ †:- اور اگر اس کے ہم مجلس آدمی کسی نیک آدمی
کو کسی اچھے کام سے روک دیں تو ان کے واسطے ہم جہنم کے پیادے بھیج دیں
گے- اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ تمام قوت خرچ کر کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کے مقابلہ میں آجائیں تو بھی کامیاب نہیں ہو سکتے- رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کو اکیلا نہیں سمجھنا چاہیے- حق کی اطاعت کرنے والی روحیں ان کے ساتھ ہیں-
اگر وہ ہاتھا پائی (جنگ دست بدستی) کریں گے تو شکست کھائیں گے.
اب تیسری فصل شروع ہوتی ہے جس میں یہ ہے کہ تو طاغی کی اطاعت نہ کر-
تیری اطاعت کرے اور تیرے آگے ذلیل ہو کر تابع ہو جائے- ایسی کوشش کرو
ایسی تعلیم عام کرو کہ مجبوراً اس طاغی کو تیری اطاعت کرنی پڑے.
آیت (۱۹) کلا لا تطع :- اطاعت نہ کر، یعنی ان لوگوں سے صلح نہ کر- کفار
یہ چاہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، کفار کے ظلم کرنے اور ان کی
بت پرستی کو برا کہنا چھوڑ دیں- کسی خاص کا نام لے کر ذکر نہیں کیا جاتا
عام طور سے مخاطب کیا جا رہا ہے- اور اس میں قریش مکہ اور ان کے آباء و اجداد
شریک تھے- اس واسطے وہ اس کو برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم ظلم اور شرک کو برا کہیں- صلح کے معنی یہ ہیں کہ ایک فریق
دعویٰ کا کچھ حصہ چھوڑ دے، تو اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دعویٰ
کا کچھ حصہ چھوڑ دیتے تو تمام تعلیم برباد ہو جاتی لیکن آپ اپنے دعویٰ پر بڑی
پختگی سے قائم رہے- اسی سبب سے کامیابی ہوئی.
**واسجد واقترب** :- اور سجدہ کر اور قرب حاصل کر- سجدہ کے معنی ہیں خدا
کی پوری اطاعت اور قرب سے مطلب ہے کہ حظیرۃ القدس کے جو مقدس درجے ہیں ان
تک پہنچنا- مثلاً حکم دیا گیا ہے کہ کافروں کی اطاعت نہ کرو اور ان سے صلح نہ
کرو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو حکم دیا جاتا ہے، اس کی پوری اطاعت کرو- یہ
نہیں کہ کسی معاملہ میں کفار سے صلح کر لی اور کسی میں چپکے ہو رہے، بلکہ

---

* نادی = شراب کی مجلس میں بیٹھنے والا.
† اشارہ جنگ بدر کی طرف ہے- زبانیہ، انصار و مہاجر کی ایسی جماعت تھی، (جیسے
بلال رضہ وغیرہ) جس کو قریش سے نہ کوئی تعلق رحمی تھا اور نہ تعلق احسانی تھا-
وہ اپنے معبود برحق اور محبوب الٰہی کی محبت میں سرشار تھے- جنگ میں کفار
کو بے تحاشا مار کر ڈھیر کر دیا اور طاغی کے معاونین سب بھاگ گئے- وللہ الحمد.

آن سے صلح کرنے کی سخت ممانعت کی گئی ہے اور سجدہ کے معنی ہیں کہ اِس حکم کی پوری اطاعت کرو اور اس حکم کے آگے سر بسجود ہو جاؤ، جیسے کہ بادشاہ حکم دیتا ہے اور اُس حکم کی اطاعت کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ اُسی دم بادشاہ کو سجدہ کیا جاتا ہے.

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ظالموں سے کسی قسم کی مصالحت نہیں کی حتیٰ کہ قیصر و کسریٰ جو ظالم حکومتیں تھیں آن کو بھی دھمکایا۔ آن کے سر برسر پرخاش ہوئے۔ اور آپ کے ھاتھ سے اللہ تعالیٰ نے انقلاب کامیاب بنا دیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب کا درجہ اِس قدر بلند ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کلام کیا ہے وہ کلام الٰھی مانا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جو کام آپ نے کیا ہے اُس کو بھی لوگ فرشتوں کے کام کی طرح مانتے ہیں اور یہ نتیجہ محض اِس امر کا ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی پوری اطاعت کی.

غرض سورۂ فاتحہ دعویٰ ہے اور یہ سورۃ اُس کا نتیجہ ہے۔ اُس میں بین الاقوامیت زیادہ ہے اور اِس میں قومیت زیادہ ہے۔ اس دعویٰ کے موقع پر وہ سورۃ پیش کی گئی ہے جو بین الاقوامیت کے مساوی ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں قومی انقلاب مکمل کر دیا اور اس کے نتیجہ میں یہ سورت منتھیٰ کر دی گئی ہے

**واسجد واقترب**:- ایک ضروری خطرہ دور کرنا ہے، وہ یہ کہ ظالم طاغی کہیں گے کہ یہ جو اپنے آپ کو خیرخواہ اور مصلح اور خیرخواہ خلق بتا رہا ہے اور لوگوں کو عام تعلیم دے رہا ہے اور لوگوں کو ہم سے متنفر کر رہا ہے اِس کا مطلب یہ ہے کہ یہ خود امیر بننے کا ارادہ رکھتا ہے اور جب لوگ اس کے پاس جمع ہو جائیں گے تو یہ بھی لوگوں پر ظلم کرے گا۔ کیوں کہ جب بہت لشکر اُس کے پاس جمع ہو جائے گا تو اُس کے اخراجات کے واسطے وہ مسکین لوگوں پر ظلم کرے گا۔ تو یہ ہم سے حکومت و ریاست چھین کر اپنے ھاتھ رکھنا چاھتا ہے اور یہ بات تاریخ سے عام طور پر ثابت ہے کہ ایک شخص مظلوموں سے ھمدردی کرنے کے واسطے کھڑا ہوتا ہے اور جب کامیاب ھوتا ہے تو اُسی طرح ظلم کرنے لگ جاتا ہے۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم کیا جاتا ہے کہ ایک تو کسی ظالم کی اطاعت نہ کر کہ وہ تیری اطاعت کرے۔ اور ہر وقت اللہ تعالیٰ کو سجدہ کیا کر اور اُس کا قرب حاصل کر۔ جب شاھنشاہ کا قرب حاصل ھوا، اور اُس کے دربار میں ہر وقت حاضر رھنا ھوا تو اُس کی رعیت پر کبھی ظلم کا خیال تک نہیں آئے گا۔ مقرب بارگاہ الٰہی کبھی کسی پر نہ ظلم کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو ظلم کرنے دیتے ہیں۔ سوائے خدائے تعالیٰ کے اور کسی کے قرب حاصل کرنے سے انسان طاغی بن جاتا ہے۔ ـــ

... تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے درپے هوگا تو ممکن نہیں کہ اُس سے ظلم
... - یا لوگ اُس کے حق میں ایسا خیال کر سکیں- یہ سورت قومی تعلیم و تربیت
... هے- عربی قوم میں کیا کیا نقص هیں اُن کو رفع کرنا مقصود هے- آنحضرت
... علیہ وسلم نے اپنی حیات مبارک میں عرب کی تکمیل کر دی - اور اِس سورت
... یہ هے کہ هر انسان میں ایسی روح پیدا هونی چاهیے کہ جو علم حاصل
... اور دوسروں کا مظلوم هو کر نہ رهے اور خود بهی ظالم نہ بنے- اس مرض کے
... کرنے کا طریقہ یہ هے کہ الہامی علوم کی انسانوں میں وقعت پیدا کر دینی چاهیے
... طاغی کی کوئی بات نہ ماننی چاهیے- اللہ تعالیٰ کے آگے جھکنا اور سجدہ
... وہ اپنے اوپر ضروری سمجھے اور قرب الٰہی کو ڈھونڈے- کیوں کہ جب وہ تقرب
... حاصل کرنے کا شوق رکھتا هے تو اُسے گناہ کا خیال تک نہیں آتا.
... سورت پہلی سورت هے جس میں لڑائی کا حکم دیا گیا هے- فَلْيَدْعُ نَادِيَه -
... زبانیہ: یہ تو صریح هے اور لا تطع میں قطع تعلقات اور الٹیمیٹم هے- اس سے
... ضرور چھڑ جاتی هے.

# سُورَۃُ الْقَدْرِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ خَمْسُ آیَات

سورہ التین مکہ میں نازل ھوئی اور اس کی آٹھہ آیتیں ھیں

97

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ھے

اِنَّآ اَنْزَلْنٰہُ فِیْ لَیْلَۃِ الْقَدْرِ (۱) وَمَآ اَدْرٰکَ مَا لَیْلَۃُ الْقَدْرِ (۲) لَیْلَۃُ الْقَدْرِ

ھم نے اس کو آتارا شبِ قدر میں اور تو نے کیا سمجھا کہ کیا ھے شبِ قدر، شبِ قدر

خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَھْرٍ (۳) تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوْحُ فِیْھَا بِاِذْنِ رَبِّھِمْ مِّنْ

بہتر ھے ہزار مہینے سے آترتے ھیں فرشتے اور روح اس میں اپنے رب کے حکم سے

کُلِّ اَمْرٍ (۴) سَلٰمٌ ھِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ (۵)

کام پر امان ھے وہ رات صبح کے نکلنے تک

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ o

# سورۃ القدر مکیۃ

قرآن مجید کی پہلی سورت "اقرء باسم ربك الذی خلق" لیلۃالقدر میں نازل ہوئی - لیلۃالقدر کا اگر آج کی زبان میں ترجمہ کیا جائے تو کہا جائے گا بجٹ کی میٹنگ میں حظیرۃالقدس میں ایک کام پیش ہوتا ہے اور پھر اُس پر فیصلہ ہوتا ہے۔ تو یہ کام جو ہو حظیرۃالقدس میں پیش ہوا ایک ہزار ماہ کے لیے ہوا ہے۔ غرض اِس مجلس میں حظیرۃالقدس) قرآن کے نازل ہونے کا فیصلہ ہوا تو قرآن مجید کا اثرِ شخصی (لفظی یعنی اُس کی صورت کا اثر) ایک ہزار سال تک دنیا میں قطعی طور پر کامل ہو کر رہے گا۔ (یعنی یوں تو یہ کتاب ہمیشہ کے لیے دنیا میں رہے گی مگر صحیح لفظوں میں اس پر عمل ایک ہزار ماہ تک کامل ہوکر رہے گا)۔ ہماری سمجھ میں ایک سال میں ماہ کا ہوتا ہے۔ رمضان اور ذی‌الحج کے دو ماہ اس عملی وقت میں شمار میں نہیں گئے۔ انہیں چھٹی کے دو ماہ سمجھنے چاہییں۔ اور سال میں عملی مہینے دس ماہ سمجھنے چاہییں۔ تو اِس طرح ایک ہزار مہینے ایک سو سال کے برابر ہو جائیں گے۔ جیسا کہ سورۃ ق والقرآن المجید میں پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ اور اِسی کے مساوی یوں سمجھیے کہ سنہ ۸۶ ہجری میں یہ سو برس پورے ہوتے ہیں۔ اُسی سال ولید نے عمر بن عبدالعزیز رضہ کو مدینہ منورہ کا حاکم مقرر کیا۔ اور انھوں نے مدینہ کے علماء کو جمع کر کے سنت (حدیث) کے لکھنے کی بنیاد ڈالی۔ اُس وقت تک مسلمانوں کے پاس قرآن‌مجید کے سوائے کوئی اور قانون نہیں تھا۔ اب یہ قانون اقصائے چین سے لے کر مغرب تک پہنچ گیا۔ متمدن اقوام عالم نے اس قانون کو اپنا دستورالعمل بنا لیا اور اپنا سمجھا۔

شروع میں سنت کو قرآن مجید کا ایک شارح (Bye-laws) بنا دیا گیا۔ یعنی اصلی قانون تو قرآن مجید ہے اور یہ سنت اس کی شارح ہے۔ مگر آگے چل کر قرآن مجید کا صرف اتنا حصہ مسلمانوں میں باقی رہا جو اُس سنت کے مطابق تھا اور بہت سا حصہ چھوٹ گیا۔ اس سنت میں عربی قومیت کے خواص خاص طور پر نمایاں ہیں۔ تیسری صدی میں قرآن مجید عربی قومیت کا ایک قسم کا قانون تھا اور سنت اُس کی

پوری شارح - قرآن مجید کی بین الاقوامی روح اس دوسری صدی میں اتنی نمایاں نہیں رہی جتنی پہلی صدی میں تھی- تیسری صدی میں جب بنو ہاشم کی سرپرستی میں عجمی قومیں آگے بڑھیں تو قرآن مجید کی انٹرنیشنل روح * زیادہ نمایاں ہونے لگی۔

آیت (۱) **انا انزلناه فی لیلة القدر** †:- ہم نے اس قرآن مجید کو لیلۃالقدر میں نازل کیا- یعنی جس رات انسانی فطرت کا بجٹ تیار ہوا تھا اس رات یہ پروگرام منظور ہوا ہے۔

آیت (۲) و ما ادراك ما لیلة القدر :- اِس آیت میں لیلۃالقدر کی تفصیل ہے۔

آیت (۳) لیلة القدر **خیر من الف شهر** :- وہ لیلۃالقدر ایک ہزار مہینے سے اچھی ہے - انسان جب کسی کام کے کرنے کا مصمم ارادہ کر لے تو وہ کام نصف ± سے زیادہ ہو جاتا ہے- اب صحیح فیصلہ کے بعد اس کا صحیح دور شروع ہو گا تو اس میں وہ مجموعی طاقت کے کم حصہ کا مالک ہے یعنی اِس حصہ میں پورے کام کے آدھے سے بھی کم کام رہ جاتا ہے- ہمارا خیال ہے کہ اس لیلۃالقدر کی رات میں سو (...) سال کے کام کا فیصلہ تھا تو فیصلہ کی رات اس زمانہ سے بہتر ہونی چاہیے- یعنی پروگرام بنانے والی رات اس زمانے سے تو اچھی ہے جس زمانے میں یہ کام عملی طور پر شروع کر دیا جائے (کیوں کہ مصمم ارادہ کرنے سے آدھے سے زیادہ کام ہو جاتا ہے)۔ غرض کہ جس وقت یہ فیصلہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تو آپ نے اپنی فطرت کے مطابق عمل کیا- آپ کی فطرت یہ تھی کہ جب علم ہو جائے کہ اللہ کی طرف سے فلاں فیصلہ ہے تو آپ اپنی پوری قوت اِس کام کے سرانجام دینے میں صرف کر دیتے تھے اور پوری طرح اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے جھک جاتے تھے۔

غرض یہ رات زمین پر بھی ہزار مہینے سے بہتر ہے- کیوں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ بھی اسی طرح مکمل ہے جس طرح ملاء اعلیٰ میں مکمل فیصلہ ہوا۔

آیت (۴) **تنزل الملائکة والروح فیها باذن ربهم من کل امر** :- اس مصمم فیصلہ کا یہ اثر ہوتا ہے کہ کارکن فرشتے اور روح اس ہزار مہینے کا کام کرنے کے لیے اسی وقت نازل ہو جاتے ہیں- اور ہر قسم کا کام کرنے والے فرشتے اور روح سب ...

---

* روح کا اقتضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت اور اس کے دیدار کا اشتیاق ہو اور مَلَکیت کا تقاضا، طہارت اور نظام احسن ہے۔

† حظیرۃالقدس اسی رات کے مانند ہے۔

± نصف سے کم باقی رہتا ہے جو عمل کرنے سے پورا ہو جاتا ہے یعنی عملی دور جو آئے گا وہ نصف سے کم وقت لے گا - ایسے وقت میں علم اور اس کا پروگرام بنا کر اس پر اجتماع کرنا ہے۔

ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کام کی بنیاد ڈالنی شروع کر دیتے ہیں اور تمام شعبوں میں کام کرنے لگ جاتے ہیں اور اس کام کے مبادی، شروط اور علل کے مہیا کرنے میں وہ فوراً اپنا کام شروع کر دیتے ہیں اور وہ کام ایک ہزار ماہ میں پوری طرح مکمل ہو جاتا ہے جیسا کہ فیصلہ ہوا تھا۔

آیت (۵) سلام ھی حتیٰ مطلع الفجر: اس رات میں جس کام کی بنیاد رکھی جاتی ہے اس میں کامیابی ہی کامیابی ہے یعنی سلامتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کام میں ناکام بنانے والی کوئی طاقت آ ہی نہیں سکتی۔ اگر ادنیٰ آدمی کو بھی اس کام پر مامور کیا جائے تو بھی صحیح سلامت کام ہو جائے گا۔ اس لیے کہ لوگوں (انسانیت) میں روحانیت اور ملکیت کی تشنگی اس رات نازل کردی گئی تھی۔ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کام کے چلانے میں تکلیف نہ ہوگی۔

سورۃ العلق میں آیت (۱۹) کلا لا تطع میں جو ذکر ہے کہ تم مخالفوں سے صلح نہ کرو، اس کے متعلق اس سورۃ میں یقین دلایا گیا ہے کہ اس سو برس کے عرصہ میں کوئی چیز تم کو ناکام نہیں بنا سکے گی۔ اس واسطے تم کو ڈٹ کر اپنا کام کرنا چاہیے۔ اگر کوئی مخالفت کرے گا تو اس کا ہم سر توڑ دیں گے۔ مطلع الفجر سے اگر قیامت مراد لی جائے تو معنی ہوں گے کہ تشنگی، ملکیت اور روحانیت کی انسانوں میں نازل ہوتی رہے گی۔ ملکیت کا تقاضا ہے نظام احسن، طہارت اور عدالت۔ روحانیت کا تقاضا ہے تعلق باللہ اور اس کے نور میں فنائیت۔ اگر روحانیت فقط ہے تو رہبانیت ہے۔

جب دنیا کا انٹرنیشنل مرکز ۱۰۰ برس میں اپنے مرکز کو مضبوط بنا لے گا تو اس کے بعد کیا پروگرام دیا جائے، اس کے متعلق ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس بارے میں دوسری نسل والے خود سوچیں گے اور اس پر وقت کے اقتضا کے مطابق کام کریں گے۔ اس واسطے اس کے متعلق یہاں ذکر کرنے کی حاجت نہیں ہے۔

بعض لوگ عمر بن عبدالعزیز رض کو دوسری صدی کے خاتمے پر مجدد مانتے ہیں اور وہ ۱۰۰ ہجری میں خلیفۂ اسلام ہوئے تو اس زمانے کو ان کی تجدید کا زمانہ کہتے ہیں کہ دوسری صدی کے سر پر ایک مجدد آ گیا۔ مگر ہم اس کی تجدید ۸۷ ہجری سے گنتے ہیں جو نبوت کے ۱۰۰ برس بعد ہوئی اور چودہ (۱۴) برس مسلسل رہی یہاں تک کہ خلافت پر پہنچے۔ اور خلافت کا کام صرف دو سال کے قریب انہوں نے سر انجام دیا۔ مگر ان کا کام درحقیقت نبوت کی صدی سے شروع ہوتا ہے۔ انہوں نے انٹرنیشنل روح قائم کرنے کے لیے آیت إن اللہ یامرکم بالعدل والاحسان الآیہ کا خطبہ جمعہ میں داخل کر دیا جس کا مسلمانوں کے خطبہ میں آج تک اعلان ہوتا ہے۔ عمر بن عبدالعزیز رض کی تجدید کا جو دور ہے اس کے متعلق ہمیں خوشی ہے کہ اسی

زمانے میں سندھ فتح ہوا۔ آپ کی خلافت کے زمانے میں جو دو سال کے قریب
سندھ کا اکثر حصہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ ہندوستان میں اسلام کا یہ اول
اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ پنجاب، کشمیر، سندھ
اور افغانستان وغیرہ میں جس قدر قومیں بستی ہیں یہ ہندستان کے مسلمانوں کی
جماعتیں ہیں اور یہی امامت کی حقدار ہیں۔ دریائے سیحون در حقیقت یہی
ہے جس کا حدیث میں ذکر آتا ہے۔ ہندی میں اس کا نام ہے سین - اور
صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حدیث میں اس کا نام سیحون ذکر کیا ہے،
اختلاف نہیں ہے، ملکی زبانوں میں ایسے اختلافات عموماً ہوتے ہیں۔ پنجاب کے
دریا اور کابل کا دریا وغیرہ درحقیقت دریائے سندھ کا احاطہ ہیں۔ ہندوستان
تمام ہندوستان ہندوؤں کے لیے چھوڑ سکتے ہیں۔ مگر اِس علاقہ یعنی پنجاب،
سندھ، فرنٹیئر، بلوچستان اور افغانستان سے ہم کبھی دست بردار نہیں ہو سکتے
وہ تمام دنیا کو ہمارے مقابلے پر لے آئیں۔ غرض مسلمانوں کا مرکزی حصہ
اِس طرح عربی قوموں کا مرکز نیل اور فرات کا درمیانی حصہ ہے اور عجمی
مرکزی حصہ جیحوں اور سندھ کا درمیانی حصہ ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ
سر زمین سے تعلق رکھنے والے تھے۔

عمر بن عبدالعزیز رضہ نے قرآن کے ماتحت عربی ذہنیت کو مہذب کر
خیال ہے کہ عجمی ذہنیت کو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے زندہ اور مہذب کیا
بہت بڑے امام ہیں۔ آپ عجمی قوم کو قرآن مجید اور فقہ کے مطابق اور
عمل کرانے کے لیے عجمی ذہنیت مدنظر رکھتے ہیں۔ مثلاً ایک عورت ہے
کو حمل ہے۔ اُس کی شادی نہیں ہوئی اور وہ زنا کی بھی قائل نہیں ہوتی۔
کے خلاف شہادت بھی میسر نہیں ہوتی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اُس کو رجم
دیتے ہیں مگر امام ابوحنیفہ اُس کو رد کرتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جب
کی مرتکب ہونے کی قائل نہیں اور اُس کے خلاف ثبوت بھی نہیں ملتا تو
میں اُسے کیسے رجم کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر حضرت مریم علیہا السلام
لیجیے کہ آپ کو حمل بھی تھا اور آپ زنا کی بھی مرتکب نہیں ہوئیں
باوجود آپ کی دین داری کی دنیا گواہ ہے؛ غرض اِسی طرح اُس عورت کا
ہے۔ شک کا فائدہ ہمیشہ ملزم کو دینا چاہیے۔

امام ابوحنیفہ نے نہ امامت کا دعویٰ کیا اور نہ حکومت سے منصب لیا
کسی سے کوئی پیسہ لیا بلکہ اپنا تمام علم مسلمانوں کو دے دیا۔ اور
کی آیات میں سے ایک آیت تھی کہ اُس نے عجمی قوموں کی ہدایت کے لیے

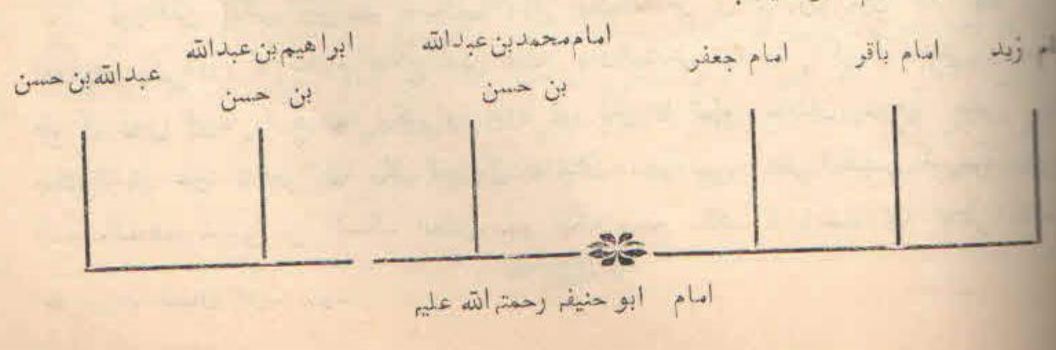
جیسا برگزیدہ انسان پیدا کیا جس نے قرآن مجید کے سمجھنے میں عجمی لوگوں کی ذهنیت بدل دی ۔ هم ابو حنیفہرح کے فقہ کی تقلید اِس لیے نہیں کرتے کہ همارے آبا و اجداد اس کے قائل تھے بلکہ اس کی وجہ یہ هے کہ هندوستان، ایران، افغانستان اور ترکستان میں ابو حنیفہ کے فقہ کے سوائے کوئی حکومت قائم نہیں هو سکتی ۔ اس میں اگر اختلاف هے تو صرف ایران کے شیعوں کا ۔ مگر هم امام ابوحنیفہرح کے فقہ کو ائمۂ اهل بیت کے ساتھ ملا سکتے هیں ۔ شیعوں کے دو فرقے هیں ایک زیدی اور دوسرا امامیہ ۔ زیدی فرقہ کے امام حضرت زید هیں اور امامیہ فرقہ کے امام حضرت امام جعفر صادق هیں ۔ اور امام ابو حنیفہ رحمۃاللہعلیہ ان دونوں بزرگوں کے براہ راست شاگرد هیں ۔ اس کے علاوہ امام ابو حنیفہ امام باقر کے بھی شاگرد هیں ۔

ان بزرگوں کے علاوہ دو حسینی امام هیں (۱) محمد بن عبداللہ بن حسن اور (۲) ابراهیم بن عبداللہ بن حسن بن حسن علی علیہم السلام ۔ انہیں حسن مثنی کہتے هیں ۔ یہ دونوں بزرگ خلیفہ منصور سے لڑے هیں اور امام ابو حنیفہ ان دونوں کے شاگرد هیں اور ان دونوں بزرگوں کی تحریک خلافت کے مؤید اور معاون هیں اور اُن کو مدد دیتے رهے ان دونوں اماموں کے والد عبداللہ بن حسن بھی امام ابو حنیفہ کے اُستاد تھے ۔ غرض حضرت علی علیہ السلام کی اولاد میں جتنے امام گزرے هیں امام ابو حنیفہ کا تعلق ان تمام اماموں سے ثابت هے ۔ اسی طرح عبداللہ بن مسعودرض کی اولاد میں جتنے امام پیدا هوئے امام ابو حنیفہ کا ان تمام کے ساتھ تعلق تھا ۔ اور یہ تمام ائمۂ اهل بیت ظالم مسلمان بادشاہ سے لڑنا فرض سمجھتے تھے ۔ اسی واسطے آپ خلیفہ منصور کے خلاف سید حسن مثنی کی تحریک کے مؤید تھے ۔

امام مالک بھی مدینہ میں امام ابو حنیفہ کے مانند اس تحریک خلافت کے مؤید تھے ۔ منصور کے نائب مدینہ نے امام مالک کو تو خود سزا دی اور خلیفہ منصور نے امام ابو حنیفہ کو جیل میں ڈال کر کوڑے کی سزا دلائی ۔ حتیٰ کہ آپ جیل هی میں فوت هو گئے ۔

هارون الرشید کے زمانے میں برامکہ بڑے کامیاب اور مشہور وزیر گزرے هیں ۔ یہ تمام ابو حنیفہ کے شاگردوں کے تربیت یافتہ هیں ۔ امام ابو حنیفہ رحمۃاللہ علیہ کے شاگردوں میں امام ابو یوسف نے ان کی خاص تربیت کی ۔

اُستادان امام ابو حنیفہ :-



امام ابوحنیفہ اگرچہ شاہی تعلقات سے آزاد رہے لیکن قوم اور ملک کے ساتھ ان کے جو تعلقات تھے وہ خود ایک ملکی حیثیت رکھتے تھے جس کے فرائض کو انہوں نے اس دانائی اور ہوشمندی کے ساتھ سرانجام دیا جو ایک مدبر سلطنت کے شایان شان تھے۔ ان کے حلقہ درس سے جو شاگرد نکلے وہ ملکی عہدوں پر پہنچے اور نہایت دیانت اور قابلیت سے اپنی خدمتوں کو انجام دیا۔ ان میں خاص طور پر قاضی ابویوسف مشہور ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ملکی تعلقات کے ساتھ مذہب اور اخلاق کے فرائض کو سمجھادینا نہایت مشکل ہوتا ہے۔ لیکن امام صاحب اس سے بےخبر نہ تھے۔ وہ شاگردوں کو ہمیشہ ایسی ہدایتیں کرتے تھے جن کی پابندی سے دین اور دنیا دونوں حاصل ہوں۔ *

فقہ حنفی نہایت تیزی سے تمام ملک میں پھیل گیا۔ عرب میں تو چنداں رواج نہ ہوا کیوں کہ مدینہ میں امام مالک اور مکہ میں ائمہ اور ان کے حریف مقابل موجود تھے۔ لیکن عرب کے سوا تمام ممالک اسلامیہ میں جن کی وسعت سندھ سے ایشیائے کوچک تھی عموماً انہیں کا طریقہ جاری ہوگیا۔ ہندوستان، سندھ، کابل اور بخارا وغیرہ میں تو ان کے اجتہاد کے سوا کسی کا اجتہاد تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ عنانِ حکومت جن لوگوں کے ہاتھ رہی وہ اکثر حنفی فقہ ہی کے پابند تھے۔ خلفاء عباسیہ تو اس بحث سے خارج ہیں کیوں کہ یہ خاندان جب تک عروج پر رہا تلوار کے ساتھ قلم کا بھی مالک رہا ہے۔ ان کو خود اجتہاد کا دعویٰ تھا۔ انہوں نے کبھی کسی کی تقلید نہیں کی۔ تنزل کے بعد وہ اس قابل نہیں رہے کہ ان کے حالات سے کسی ملکی اثر کا اندازہ کیا جائے۔ تاہم ان میں اگر کسی نے تقلید گوارا کی تو امام ابوحنیفہ کی۔

عباسیہ کے تنزل کے ساتھ جن خاندانوں کو عروج ہوا وہ اکثر حنفی تھے۔ خاندان سلجوق جس نے ایک بڑی مدت تک حکومت کی اور جس کے دائرہ حکومت کی وسعت طول میں کاشغر سے بیت‌المقدس اور عرض میں قسطنطنیہ سے بلاد خرز تک پہنچی تھی، حنفی تھا۔ سلطان محمود غزنوی فقہ حنفی کا بہت بڑا عالم تھا۔ فن فقہ میں اس کی ایک نہایت عمدہ تصنیف موجود ہے جس کا نام التفرید ہے اور جس میں کم و پیش ساٹھ ہزار مسئلے ہیں۔

نورالدین زنگی جس نے سب سے پہلے بیت‌المقدس کی لڑائیوں میں نام پیدا کیا اور جس کے دربار کا ملازم صلاح‌الدین فاتح بیت‌المقدس تھا وہ اگرچہ شافعی و مالکی فقہ کی بھی عزت کرتا تھا لیکن وہ خود اور اس کا تمام خاندان مذہباً حنفی تھا۔ صلاح‌الدین خود شافعی تھا مگر اس کے خاندان میں بھی حنفی‌المذہب موجود تھے۔ الملک‌المعظم عیسیٰ بن الملک العادل جو ایک وسیع ملک کا بادشاہ تھا حنفی مذہب

* سیرت نعمان ص۔ ۵۸۔

میں غلو رکھتا تھا۔ چراکثہ مصر جو نویں صدی کے آغاز میں مصر کی حکومت پر پہنچے اور ۱۴۸ برس تک فرماں‌روا رہے اور بہت سی فتوحات حاصل کیں، خود حنفی تھے اور ان کے دربار میں اسی مذہب کو زیادہ فروغ حاصل تھا۔ اب تک مصری حکومت کا قانون ہے کہ قاضی سے عہد لیتے ہیں کہ حنفی مذہب پر فیصلہ کرے۔ سلاطین ترک جو کم و بیش چھ سو برس سے روم کے فرمان روا ہیں عموماً حنفی ہیں۔ خود ہمارے ہندوستان کے فرمان روا خوانین اور آل تیمور اسی مذہب کے پابند رہے اور ان کی وسیع سلطنت میں اس طریقہ کے سوائے اور کسی طریقہ کو رواج نہ ہو سکا.

تمام ممالک اسلام میں تین فقہوں نے رواج پایا:- حنفی فقہ، مالکی فقہ، شافعی فقہ۔ مسائل فقہ کی ترویج و اشاعت کا سبب اگرچہ خود ان کے مسائل کی خوبی و عمدگی ہے، لیکن کچھ شبہہ نہیں ہے کہ اس امر میں وضع فقہ کے ذاتی رسوخ اور عظمت کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔ امام ابوحنیفہ کے سوا اور مجتہدین کے فقہ کی ترویج و اشاعت کا باعث زیادہ تر ان کی ذاتی خصوصیتیں تھیں۔ امام مالک مدینہ میں رہنے والے تھے جو نبوت کا مرکز اور خلفاے راشدین کا دارالخلافہ رہ چکا ہے اور ان کا خاندان ایک نسبی خاندان رہ چکا ہے۔ اسی طرح امام شافعی کا وطن مکہ معظمہ تھا۔ باپ کی طرف سے قریشی اور ماں کی طرف سے ہاشمی تھے۔ مکہ معظمہ کی ولادت، خاندان کا اعزاز اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم نسبی ایسی چیزیں تھیں جن سے بڑھ کر حسن قبول اور مرجعیت کے لیے کوئی آلہ کارگر نہیں ہو سکتا تھا۔ امام ابوحنیفہ میں اس قسم کی کوئی خوبی موجود نہ تھی اور نہ کوئی خصوصیت تھی۔ وہ عربی‌النسل بھی نہیں تھے۔ خاندان میں کوئی ایسا شخص نہیں گذرا جو اسلامی گروہ کا مرجع اور مقتدر ہوتا۔ آبائی پیشہ تجارت تھا اور خود بھی تمام عمر اس ذریعے سے زندگی بسر کی۔ غرض کہ حسن قبول اور عام اثر کے لیے جو اسباب درکار ہیں وہ بالکل نہ تھے۔ اس کے باوجود ان کے فقہ کا تمام ممالک اسلامیہ میں اس وسعت اور ترقی کے ساتھ رواج پانا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا طریقہ فقہ انسانی ضرورتوں کے لیے نہایت مناسب اور موزوں واقع ہوا تھا اور بالخصوص تمدن کے ساتھ جس قدر ان کے فقہ کو مناسبت تھی، کسی فقہ کو نہ تھی.

وضع مسائل میں شافعی اور مالکی، فقہ حنفی کی تقلید کرتے ہیں۔ علم کا پہلا ذریعہ ہے وضع سوال۔ جس طرح وضع سوال کی امام ابوحنیفہ نے اختیار کی اس کو تمام فقہ والے اختیار کرتے ہیں۔ امام شافعی نے خود جا کر امام محمد سے فقہ کے قواعد سیکھے۔ اسی طرح مدونہ کی تدوین کرنے والے امام ابوالقاسم مالکی نے امام ابوحنیفہ کے شاگردوں سے فقہ سیکھا۔ فقہ میں بڑی مشکل بات وضع سوال ہے تو یہ بات فقہ حنفی کی ایجاد شدہ ہے.

# سُورَۃُ الْبَیِّنَۃِ مَدَنِیَّۃٌ وَ ھِیَ ثَمَانُ آیَاتٍ

سورہ البینہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی آٹھ آیتیں ہیں

98

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَالْمُشْرِکِیْنَ مُنْفَکِّیْنَ حَتّٰی

نہ تھے وہ لوگ جو منکر ہیں اہل کتاب اور مشرک باز آنے والے یہاں تک

تَاْتِیَھُمُ الْبَیِّنَۃُ (۱) رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰہِ یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَھَّرَۃً (۲) فِیْھَا کُتُبٌ

کہ پہنچے اُن کے پاس کھلی بات، ایک رسول اللہ کا پڑھتا ہوا ورق پاک، اُس میں لکھی ہیں کتابیں

قَیِّمَۃٌ (۳) وَ مَا تَفَرَّقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْھُمُ

مضبوط اور وہ جو پھوٹ پڑی اہل کتاب میں سو جب کہ آچکی اُن کے پاس

الْبَیِّنَۃُ (۴) وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ

کھُلی بات اور اُن کو حکم یہی ہوا کہ بندگی کریں اللہ کی خالص کرکے اُس کے واسطے بندگی

حُنَفَآءَ وَ یُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ یُؤْتُوا الزَّکٰوۃَ وَ ذٰلِکَ دِیْنُ الْقَیِّمَۃِ (۵) اِنَّ الَّذِیْنَ

ابراھیم کی راہ پر اور قائم رکھیں نماز اور دیں زکواۃ اور یہ ہے راہ مضبوط لوگوں کی اور جو

کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَالْمُشْرِکِیْنَ فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا

منکر ہوئے اہل کتاب اور مشرک ہوں گے دوزخ کی آگ میں سدا رہیں اُس میں

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم○

# سورۃ البینۃ مدنیۃ

سورۃ بیّنہ میں ہے کہ ذہنی اور سوشل انقلاب کسی اہل کتاب یا مشرکین کی کسی جماعت نے نہیں کیا وہ ری اکشنری ہو گئے تھے۔ اس لیے ضرورت تھی کہ ایک نبی آ کر انقلاب کرے۔ و ما تفرق الذین الآیہ میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک فرقہ اہل کتاب میں سے بھی انقلابی ہو گیا، تو وہ بھی اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے آن کو برانگیختہ کیا۔ و ما تفرق الذین یعنی دو فرقہ ہوئی، ایک جماعت انقلابی ہوئی اور ایک انقلابی نہ ہوئی۔ جو انقلابی تھے انھوں نے پورا انقلاب نہیں کیا بلکہ انقلاب میں کچھ حصہ لیا۔

الحاصل اِس سورت کا مطلب ہے کہ قرآن، اِسلام کا ایک عمومی پروگرام ہے۔ (سورۃ القدر میں اس کا بیان ہو چکا ہے) اور اس کا عملی مجسمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ کوئی تعلیم جب تک انسانی شکل میں مجسم نہ ہو جائے دنیا میں انقلاب پیدا نہیں کر سکتی۔ اس سورۃ کا بس اتنا خلاصہ ہے۔

آیت (۱) لم یکن الذین کفروا* من اهل الکتاب † الآیہ:۔ اہل کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ اپنے دین پر عمل کرنا چھوڑ بیٹھے وہ لوگ کبھی باز نہ آئیں گے جب تک کہ ان کے پاس البینہ نہ آجائے۔

آیت (۲) رسول من اللہ یتلوا الآیہ:۔ اس بینہ کی تفسیر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا رسول ہے۔

یتلوا صحفاً مطہرۃ:۔ ان مقدس صحیفوں میں نہ ٹوٹنے والے قانون ہیں جو فطرت

---

* حضرت شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم اپنی تصنیفات میں ایک کُلّی نظام کا لفظ انقلاب کی جگہ پر فرماتے ہیں:۔ تھوڑے عرصہ میں یعنی ۱۰۰ سال میں انقلاب روحانی و ملکیت جو کہ نصب العین کتاب اللہ کا ہے اور جس کا ذکر سورۃ القدر میں ہوا ہے وہ انقلاب نہ مشرکین سے اور نہ اہل کتاب سے ہو سکتا تھا، اگرچہ حکومتوں کے انقلاب ہوئے۔

† تین فرقے جو کہ خود کو حضرت ابراهیم علیہ السلام کے پیرو جانتے تھے انقلاب روحانی و ملکیت نہیں کر سکتے تھے اِس لیے نئی جماعت کی ضرورت محسوس ہوئی۔

أُولٰئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ (٦) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰئِكَ

وہ لوگ ہیں سب خلق سے بدتر، وہ لوگ جو یقین لائے اور کیے بھلے کام وہ لوگ ...

هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ (٧) جَزَاؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

سب خلق سے بہتر، بدلہ آن کا آن کے رب کے یہاں باغ ہیں ہمیشہ رہنے کو نیچے بہتی ہیں آن کے ...

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ

سدا رہیں آن میں ہمیشہ، اللہ آن سے راضی اور وہ آس سے راضی یہ ملتا ہے آس کو جو ڈرا اپنے رب سے

---

انسانی کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ فطرت انسانی جب تک اس رنگ پر رہے گی ... پر کہ وہ ابتدا سے چلی آ رہی ہے آس وقت تک وہ قانون اِسی طرح رہیں گے۔ ہر ... سورت مقدس صحیفہ ہے۔

رسول ایک انسان ہے جسے تمام مقدس کتابوں کا خلاصہ یاد ہے۔ وہ تمام ... کتابوں کو قانون فطرت پر جمع کر سکتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ کوئی نبی ... اس کے کہ انسانی فطرت کے طبعی قوانین سکھائے اور کوئی کام نہیں کرتا۔ اِس ... میں تمام دین ایک ہیں اور ہر ایک دین کو اپنی صحت کے لیے اس انٹرنیشنل ... اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔

(آیت ۴ دیکھو آیت ۵ کے بعد)

آیت (۵) و ما اُمروا اِلا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین :- وہ مشترک ... ہے کہ وہ سارا دین اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے مخصوص کر دیں۔ آن کا قانون یہ ... اللہ تعالیٰ کی پوری غلامی کی جائے اور اس کے سوائے کسی کی غلامی نہ کی جائے ...

حنفاء :- اور وہ دین حنیفی طریقہ پر ہو کہ جس میں کسی قسم کا کوئی ... سامنے رکھ کر عبادت نہ کی جائے اس لیے کہ اگر کوئی مجسمہ سامنے رکھا گیا ... پھر ہر ایک قوم اپنے اپنے مجسمے سامنے رکھے گی اور اس طرح اتحاد نہیں ہوگا ... ہے حنفاء کا ترجمہ۔ یعنی تم میں سے ہر ایک حنیف بن جائے۔ حنیف لقب ہے ابراہیم علیہ السلام کا۔ اس میں فائدہ یہ ہوگا کہ ایک تو تمام قومیں آپس میں متحد ہو جائیں گی اور دوسرے انسان کی عقلیت پر زیادہ زور آئے گا بنسبت آس کی حسّیات کے اور ...

انسانیت کے مرکز سنبھالنے والی ایک صحیح طاقت پیدا ہو جائے گی جو عقلیات پر بحث کرنے والی ہوگی اور ایک ہی نظریہ پر متفق ہو جائے گی۔ یہ ہے فائدہ حنفاء ہونے کا۔ عقلی باتوں پر اعتقاد کرنے والی تمام قوموں میں جس قدر حکیم پیدا ہوں گے اُن کا ایک ہی مسلک ہوگا۔ اور انسانیت اُن سے باہر نہیں جا سکے گی۔ حنفاء ہونے سے یہ فائدہ پہنچ رہا ہے کہ لوگوں کو ایک مرکز پر آنے کا طریقہ بتلا دیا گیا۔

کسی انقلابی انسان کو دیکھنے کے بعد انسان میں انقلاب آتا ہے یعنی انسان کسی دوسرے انقلابی زندہ انسان کی صحبت سے انقلاب سیکھ سکتا ہے۔ تو جس زندہ انسان کی صحبت سے کسی نے کچھ سیکھا ہے اُس کی تصویر یاد رکھنے کے لیے اگر اُس کا مجسمہ رکھنے کی ضرورت ہو تو وہ بالکل پاگل آدمی ہے جو اس طرح اُس کا مجسمہ سامنے رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس انسان کی صحبت سے انسان فیض یاب ہوتا ہے اُس کی صورت تو انسان کے دماغ میں خودبخود رہتی ہے اور یہ انسان کی عقلی قوتوں کو مؤثر کرنے کے لیے کافی ہے۔ اور گزشتہ بزرگوں کی تصویریں یاد کرنا اور اُن کے مجسمے سامنے رکھنا، انسان کو حقائق سمجھنے سے قاصر کر دیتا ہے۔ اس سے انسان کے دماغ پر ہر قسم کے خرافات قابض ہو سکتے ہیں۔ کیوں کہ جب کوئی شخص کسی گذشتہ انسان کی صورت اپنے دل میں بٹھاتا ہے اور وہ نہ اُس کو جانتا ہے اور نہ اُس کی حقیقت کو جانتا ہے بلکہ کسی کے بتانے پر تصور کر لیتا ہے تو اِس سے بہت سے خرافات دماغ پر قابض ہو سکتے ہیں۔ محض وہمیات کو اُس کی طرف منسوب کر کے اُن کو اعتقادیات کے درجہ پر پہنچا دیتا ہے۔ اِس لیے اُستاد کی دیکھی ہوئی تصویر جو دماغ میں بیٹھ جاتی ہے کافی ہے کیوں کہ اس سے فقط اُن کے اعمال و افعال کی یاداشت دل میں اُترتی ہے۔ اس کے سوا اور کوئی وہمیات اُس کے دماغ پر اثر نہیں کرتیں۔

خلاصہ یہ نکلا کہ انسان کو جس قدر ایک اُستاد کی صورت سامنے رکھنے کی ضرورت ہے وہ مجسمہ رکھنے کے بغیر ہی حاصل ہے۔ اگر حقیقی اُستاد کے سوا کسی دوسرے کا مجسمہ سامنے رکھا جائے تو یہ انسان کی غلط رہنمائی کرتا ہے۔ اس لیے تصویر سامنے رکھ کر عبادت کرنے کا طریقہ بالکل منسوخ کر دیا گیا۔ یہ ہے حنیفی دین کا خاصہ کہ جس پر قانون مبنی ہے اور جس کی دعوت قرآن مجید دیتا ہے۔

و یقیموا الصلوٰۃ و یوتوا الزکوٰۃ :- نماز پڑھیں اور زکواۃ دیں۔ اس کی تشریح گزشتہ سورتوں میں کافی ہو چکی ہے۔

و ذالک دین القیمہ :- یہ وہ قانون ہے جو نہ تو کبھی شکست پا سکتا ہے اور نہ کبھی ٹوٹ سکتا ہے۔

آیت(۴) و ما تفرق الذین اوتوا الکتاب الا من بعد ما جاءتہم البینہ* :- اور جب وہ بینہ آیا تو بھی یہ اہل کتاب اپنا جدا فرقہ بنا کر بیٹھ گئے اور اس کی اتباع کی تو اپنی کتاب کے حکم سے یہ مجرم ٹھہرائے جاتے ہیں.

جو حکم آیت:- و ما اُمروا اِلا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین حنفاء و یقیموا الصلوۃ و یؤتوا الزکواۃ یہ عمل مشترک ہے جو تمام ادیان میں مسلّم تھا۔ اس کی دعوت دینے والا انسان راسخ القدم سامنے آ گیا۔ اب اس کے بعد کسی اہل کتاب کو کیا حق ہے کہ وہ انٹرنیشنل نقطہ سے علحدہ ہو جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر مذہب کی کتابوں میں اُس شخص (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق پیشین گوئی موجود ہے۔ (انجیل میں فارقلیط، توراۃ میں مسیخ یا مسیح اور ہندو ویدوں میں رام کے آنے کی پیشین گوئی اور اہل فارس میں اِس طرح کہ ایک شخص آئے گا جس کا نزول ... کے نزول کے برابر ہوگا۔ وہ نہایت آسانی سے آسمانی بادشاہت زمین پر قائم کرے گا۔ ایک مبصر انسان تمام مذہبوں کی پیشین گوئیاں جمع کرے تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پوری طرح منطبق ہوجاتی ہیں۔ تو آنے والا آگیا مگر یہ لوگ یعنی اہل مذہب ... تک انتظار کر رہے ہیں) اور اُنہیں حکم دیا گیا تھا کہ جب وہ شخص آئے تو ... کی اطاعت کریں۔ اب اگر اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ، مجوس اور ہندو اپنے ... کو الگ رکھنے کی کوشش کریں تو اُن کے مجرم ہونے میں کوئی شبہہ باقی نہیں رہتا۔ اُن کی کتاب میں ان کو حکم تھا کہ جب وہ شخص آئے تو اُس کی ... اطاعت کریں۔ اور جب اُنہوں نے اطاعت سے انکار کر دیا تو وہ اپنی کتاب کی رو سے مجرم بن گئے.

آیت (۶) ان الذین کفروا من اہل الکتاب‡ والمشرکین :- اہل کتاب ...

---

* اس جگہ تفسیر روح المعانی کو دیکھو کہ وہ بھی احتمال نکالتی ہے۔ ہم نے کہا ہے کہ بعض انقلابی بنے اور بعض انقلابی نہ بنے یہ معنیٰ ہے تفرق کا۔ اور روح المعانی نے اس کو اِس طرح بیان کیا ہے کہ ایک جماعت ایمان لائی اور ایک ایمان نہ لائی۔ تو ہم اس کی بھی یوں تعبیر کریں گے کہ ایک جماعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نظریات پر ایمان لائی اور دوسری ویسی کی ویسی رہی۔ یعنی اہل کتاب کے ایک فرقہ نے تعلیم کے نقطہ پر انقلاب کیا، کسی مصنوعات کے نقطہ پر نہیں۔ ... یہ سب کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد ہوا.

‡ اہل کتاب کے ایک فرقے نے یہ انقلاب قبول کر لیا جیسے اہل شام و مصر دونوں نے انقلاب مِلکیت اور روحانیت کا قبول کر لیا۔ یا تو خود مسلمان ہو گئے یا اس انقلاب سے متاثر ہو کر کام کرنے لگے۔ ایک فرقہ ترقی کا خواہاں ہو گیا اور دوسرا فرقہ (ان الذین کفروا) کے تحت اپنی ری ایکشنری حالت پر رہا تو ... کو دنیا و آخرت میں نار جہنم ہے۔ یعنی ہمیشہ غلام رہا یہ معنی ہے و ما تفرق کا۔ واللہ اعلم.

حکم تھا کہ اس نبی کی اطاعت کرو۔ مگر وہ اس نبی کی اطاعت نہیں کرتے۔ اس واسطے وہ اپنی کتاب کے حکم کے مطابق کافر ٹھہرے۔

اب مشرکین کا ذکر آتا ہے کہ وہ اپنے سامنے صورتیں رکھ کر عبادت کرتے ہیں۔ دین حنیفی کے آنے پر یہ طریقہ بند کر دیا گیا اور یہ بات تو مشرکین مکہ پر واضح ہے۔ اس واسطے فی نار جہنم خالدین فیہا ان دونوں کی سزا جہنم ہے یعنی یہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔

اولئك هم شر البریه: وہ انسانیت کا بدترین حصہ ہیں کیوں کہ یہ ری اکشنری جماعت ہیں۔ ترقی پسند نہیں۔

آیت (۷) ان الذین آمنوا و عملوا الصالحات:- جو لوگ اس نبی کی دعوت کو مان کر اچھے کاموں میں لگ گئے اولئك هم خیر البریه: وہ انسانیت کا بہترین حصہ ہے۔

آیت (۸) جزاء هم عند ربهم الآیه:- ان کے لیے بہشت ہے۔ رضی اللہ عنہم و رضو عنه اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا اور یہ اللہ تعالیٰ سے راضی۔ مطلب یہ کہ یہ مرکزی جماعت ہے۔

ذالك لمن خشی ربه:- یہ درجہ ان لوگوں کے لیے ثابت ہوگا جو ربّانی نظام کے سلسلہ علت و معلول کو ٹھیک طرح سمجھتے ہیں۔ انہی کے دل میں سزا ملنے سے پہلے ڈر پیدا ہو سکتا ہے۔ اور ان کے دل میں عاقبت اندیشی کی وہ استعداد ہے اور یہی جماعت ہے جس کے حق میں ہے کہ انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء۔

# سورۃ الزلزال مدنیۃ وھی ثمان آیات

سورہ زلزال مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی آٹھ آیتیں ہیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم ○

شروع اللہ کے نام سے جو بےحد مہربان نہایت رحم والا ہے

اذا زلزلت الارض زلزالها (۱) و اخرجت الارض اثقالها

جب ہلا ڈالے زمین کو اس کے بھونچال سے اور نکال باہر کرے زمین اپنے اندر سے

و قال الانسان مالها (۳) یومئذ تحدث اخبارها (۴) بان ربک اوحی

اور کہے آدمی اس کو کیا ہو گیا اس دن کہہ ڈالے گی وہ اپنی باتیں اس واسطے کہ تیرے رب نے حکم

لها (۵) یومئذ یصدر الناس اشتاتا ۵ لیروا اعمالهم (۶) فمن یعمل

اس کو، اس دن ہو پڑیں گے لوگ طرح طرح پر کہ ان کو دکھائے جائیں ان کے عمل سو جس نے

مثقال ذرة خیرا یره (۷) و من یعمل مثقال ذرة شرا یره (۸)

ذرہ بھر بھلائی وہ دیکھ لے گا اسے اور جس نے کی ذرہ بھر برائی وہ دیکھ لے گا اسے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم o

# سورۃ الزلزال مدنیۃ

جو لوگ ربّانی نظام کو راست جاننے والے ہیں وہ اگر کسی گاؤں میں ہوں گے تو اساسی قانون کے تحت ایک چھوٹی سی جماعت پیدا کر دیں گے۔ اگر شہر میں ہوں گے تو اس طرز کی جماعت شہر ہی میں پیدا کر دیں گے۔ اگر کسی ملک میں ہوں گے تو اسی طرح گاؤں اور شہر کی جماعت کو ترقی دے کر ملک بھر میں جماعت بنا دیں گے اور پھر ترقی کر کے تمام دنیا میں اس قسم کی جماعت پیدا کر دیں گے۔ غرض جو شخص ربّانی نظامِ قدرت کو سمجھتا ہے وہ اس سے نیچے تو ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ جو شخص گاؤں میں اس اس قسم کا نظام پیدا کر دیتا ہے اُسے اس کی حفاظت کا بالکل یقین نہیں ہوتا جب تک ایسا نظام شہر میں پیدا نہ کر دے۔ ورنہ شہر کا فاسد نظام گاؤں میں آ کر اچھے نظام پر غالب آجائے گا۔ اسی طرح جب ایک شہر میں اچھا نظام پیدا کر دیا جائے گا تو اس پر کبھی اطمینان نہیں ہو سکتا جب تک کل ملک میں ایسا نظام پیدا نہ کیا جائے۔ ورنہ ملک کا فاسد نظام اُس شہر کے اچھے نظام کو کھا جائے گا۔ اِسی طرح جب ایک ملک میں اچھا نظام پیدا کر دیا جائے گا تو اس پر بھی کبھی اطمینان نہیں ہو سکتا جب تک کہ دنیا کی تمام متمدن قوموں کو اس نظام کا پابند نہ بنا دیا جائے ورنہ بین‌الاقوامیت کی اکثریت اس نظام کو فاسد کر دے گی اور بگاڑ کر رکھ دے گی۔ تو نظامِ قدرت کے علّت و معلول کے سمجھنے کہ لوگوں کو یہ فائدہ ہو گا کہ وہ ہر مستقبل میں آنے والے خطرے سے ڈر کر اس کی پیش بندی کردیں گے اور دنیا میں انسانیت کے لیے ایک عمدہ انٹرنیشنل مرکز پیدا کر دیں گے۔ اسلام نے اس کو پہلی صدی میں طے کرلیا ہے۔ یہ مطلب العلق، القدر اور البینہ کے ارتباط کا ہے۔

آیت (۷ و ۸) و من یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ و من یعمل مثقال ذرۃ شراً یرہ :- ان دونوں آیات میں مرکزی نقطہ سمجھایا گیا ہے۔ ربّانی نظامِ قدرت (علّت و معلول) کا جو سلسلہ ہے اُس کی انتہا یہ ہے کہ انسان جو کچھ عمل کرے گا اُس کی جزا اُس کو ضرور ملے گی۔ یہ جزا خواہ اُسے اِس دنیا میں ملے یا اگلی دنیا میں، مگر اس کی جزا

مل کر رہے گی۔ انسان اگر انسانیت کے قانون کو ذرہ بھر بھی توڑے گا (اس کا تم
برائی ہے) تو اس کی سزا اس کو مل کر رہے گی۔ یہ نظام کی پختگی کی دلیل ہے کہ
یہ نظام کسی صورت میں ٹوٹ نہیں سکتا.

اس موجودہ نظام کی رسّیاں جب ڈھیلی پڑ جائیں گی تو زمین میں انقلاب آجائے
گا اِس لیے کہ اب ڈھیلا ہونے سے یہ نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ جیسے خیمہ کی چوبیں
اور طنابیں اگر ڈھیلی پڑ جائیں تو خیمہ کھڑا نہیں رہ سکے گا۔ اور یہ قیامت کی
ابتدا ہے۔

آیت (۱ و ۲) اذا زلزلت الارض زلزالها و اخرجت الارض اثقالها :- زمین اپنے
جسم کے موافق پورے زور سے زلزلہ میں آجائے گی یعنی اِس نظام کی رسّیوں میں جب
خلل آجائے گا تو زمین ٹھہر نہیں سکے گی۔ یہ ابتدا ہے دوسری زندگی کی ۔ اور انسان
کا جو حصہ زمین میں دفن ہو گا اُس کو نکال دے گی تو انسان دوسری زندگی میں
آجائے گا۔ جتنی بوجھل چیزیں ہیں زمین اُن سب کو نکال دے گی۔ انسان اس زمین
پر صرف اسی شرط پر زندہ رہ سکتا ہے کہ یہ موجودہ نظام قائم رہے یعنی یہ سورج اور
چاند اور آسمان قائم رہیں۔ آسمان سے بارش ہو، زمین سیراب ہو وغیرہ . مگر جب یہ
نظام ٹوٹ جائے گا تو انسان کے یہاں رہنے کی گنجایش ہی نہیں۔ اسی واسطے انسان
ایک دوسری دنیا میں منتقل کیا جائے گا .

آیت (۳ و ۴) وقال الانسان مالها الآیہ : جتنے انسانی اعمال ہیں وہ تمام
ہو رہے ہیں اور انسان کے ساتھ چمٹ رہے ہیں۔ جیسے کسی نے چوری کی ہے تو
چوری کا گناہ اب چوری کی شکل میں انسان سے چمٹ رہا ہے اور انسان حیران ہو
رہا ہے کہ یہ کیسے ہو رہا ہے.

آیت (۵) بان ربك اوحى لها :- اللہ تعالیٰ نے زمین پر ایسی بارش کر دی ہے
کہ انسان کے عمل اصل شکل میں انسان کے پیچھے لگ جاتے ہیں.

آیت (۶) یومئذ یصدر الناس اشتاتاً الآیہ :- اُس دن تمام بنی نوع انسان گروہ
آئیں گے۔ یعنی ایک قسم کے اعمال کے لوگ ایک جماعت میں ہوں گے تاکہ وہ اپنے
اعمال کو دیکھ سکیں۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید میں جو قیامت کا ذکر آتا ہے اس
کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان کو ایک عجیب چیز بتلانی منظور ہے۔ بلکہ اسے یہ
بتانا ہے کہ تیرا جو کچھ عمل اس دنیا میں ہے وہ ضایع نہیں کیا گیا۔ اس زمین کے
نظام میں ایسا انقلاب پیدا کیا جائے گا کہ انسان کے کام ذرہ ذرہ محفوظ رکھے جائیں
گے۔ اور اس کا معاوضہ انسان کو دیا جائے گا۔ اسی کا نام ہے قیامت.

۱۵۵

# سورۃ العٰدیٰت مکیۃ وھی احدی عشرۃ آیۃ

سورہ عادیات مکہ میں نازل ہوئی اور اِس کی گیارہ آیتیں ہیں

## بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا (۱) فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا (۲) فَالْمُغِیْرٰتِ صُبْحًا (۳)

قسم ہے دوڑنے والے گھوڑوں کی ہانپ کر، پھر آگ سلگانےوالے جھاڑ کر، پھر غارت ڈالنے والے صبح کو

فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا (۴) فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا (۵) اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ (۶)

پھر اٹھانے والے اس میں گرد، پھر گھس جانے والے اس وقت فوج میں، بے شک آدمی اپنے رب کا ناشکر ہے

وَ اِنَّهٗ عَلٰی ذٰلِكَ لَشَهِیْدٌ (۷) وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ (۸) اَفَلَا یَعْلَمُ

اور وہ آدمی اس کام کو سامنے دیکھتا ہے اور آدمی محبت پر مال کی بہت پکا ہے، کیا نہیں جانتا

اِذَا بُعْثِرَ مَا فِی الْقُبُوْرِ (۹) وَ حُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوْرِ (۱۰) اِنَّ

جس وقت کہ کُریدا جائے جو کچھ قبروں میں ہے اور تحقیق ہووے جو کچھ کہ جیوں میں ہے، بے شک

رَبَّهُمْ بِهِمْ یَوْمَئِذٍ لَّخَبِیْرٌ (۱۱)

ان کے رب کو ان کی اس دن سب خبر ہے۔

۱ ع ۲۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

# سورۃ العادیات مکیۃ

والمورِیات

آیت (۱ تا ۵) والعادیٰت ضبحاً ... فالمغیرات صبحاً الآیات :- گھوڑوں کو بطور قسم بیان کیا گیا ہے اور ان کی پانچ قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ اُن کے سمجھنے میں مفسرین کو بہت اشکال ہے۔ اُن کی ذہنیت یہ ہے کہ جہاں کہیں قسم کا ذکر آتا ہے وہ اسے بہت مقدس سمجھتے ہیں، اس خیال سے کہ قسم ہمیشہ مقدس چیز کے لیے آتی ہے۔ اب وہ ان گھوڑوں کو بھی مقدس بنانا چاہتے ہیں۔ اس واسطے وہ ان کو غازیوں کے گھوڑے کہتے ہیں۔ مگر یہ سورت مکی ہے اس واسطے غازی کہاں اور گھوڑے کہاں! ۔ وہ کہتے ہیں کہ اس میں اشارہ ہے کہ آگے چل کر غازی اور ان کے گھوڑے ہوں گے۔ غرض اِس طرح وہ ظاہر سے بہت دور ہو گئے۔ اس واسطے بعض مفسرین نے حاجیوں کے قافلے کے اونٹوں کو اِس جگہ مراد لیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ وہ مقدس چیز ہے۔ حاجیوں کے قافلے انہی اونٹوں پر جاتے تھے اور مکی زندگی میں یہ ہوتا تھا۔ اصل وجہ اس کی یہ ہے کہ قسم کا جہاں کہیں ذکر آتا ہے وہ اس میں بہت تقدس مراد لیتے ہیں۔ مگر ہماری رائے اس کے خلاف ہے۔ ہم ان قسموں کو تقدس کے طور پر نہیں سمجھتے۔ بلکہ یہ ایک فقط لطیف شہادت ہوتی ہے جس سے لطیف ذہن کو بات جلدی سمجھا دی جاتی ہے۔ اگر اس نازک مسئلہ پر حجت اور دلیل قائم کی جاتی تو اس پر بہت جھگڑے پیدا ہو جاتے۔ اس واسطے ہم اس سے ڈاکوؤں کے گھوڑے مراد لیتے ہیں۔ اہل عرب ان سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اس جگہ ان گھوڑوں کا ذکر کر کے ایک نتیجہ نکالا جائے گا اور یہی قسم کا مطلب ہے۔

آیت (۱ و ۲) گھوڑوں کی تعریف ہے۔ آیت (۳) **فالمغیرات صبحاً** :- صبح کے وقت غارت ڈالنے والے گھوڑے۔ آیت (۴) **فاثرن به نقعاً** :- انہوں نے غبار اٹھایا یعنی حملہ کر دیا۔ آیت (۵) **فوسطن به جمعاً** :- اور دشمن کی جماعت مرکز پر پہنچ گئے لشکر کا امیر ہمیشہ وسط میں چلتا ہے تو یہ وسط پر غالب آگئے۔ ان گھوڑوں نے اپنے مالکوں کے لیے کس قدر بڑا کام کیا اور ان کو کس قدر فائدہ پہنچایا؟ یہی کہ ان کی حکومت پیدا کر دی اور اس کے ساتھ انہوں نے خود بہت سی تکلیفیں برداشت کیں مگر گھوڑوں کو کیا حاصل ہوا؟ صرف یہی کہ ڈاکو ان کو دانہ گھاس اور پانی وقت پر دیتے ہیں۔ اتنی بات پر ایک حیوان، انسان کا اس قدر اطاعت گزار ہو جاتا ہے۔

آیت (۶) **ان الانسان لربه لکنود** :- اب جوابِ قسم ہے، جس پر شہادت دی گئی ہے کہ درحقیقت انسان اپنے رب کا بہت ناشکر ہے۔ اب مقابلہ کر کے دیکھو کہ

انسان اللہ تعالیٰ کی کس قدر نعمتیں کھاتا ہے۔ اور کیا وہ گھوڑے کے برابر کام کرتا ہے؟ اس کا جواب انسان کی زبان سے نکلے گا کہ نہیں کرتا۔ اور یہی کنود کا ترجمہ ہے۔

آیت (۷) و إنه علی ذالك لشهيد :- اور ہر انسان اپنے متعلق خود گواہ ہے کہ وہ نہیں کر سکتا۔ اس شہادت سے مضمون کتنا زوردار ہوگیا ہے! اگر دلائل سے انسان کو قائل کیا جاتا تو یہ ناممکن تھا کہ انسان مانتا۔

آیت (۸) و إنه لحب الخير لشديد :- اور انسان فقط یہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی قدر نہیں کرتا اور حق ادا نہیں کرتا، اس میں یہ اندیشہ نہیں ہے کہ اس میں کسی قسم کی کمزوری ہے بلکہ یہ روپیہ پیسہ کے لیے گھوڑے سے بھی زیادہ مشقت کرنے والا ہے (شدید لفظ کے معنیٰ دوڑنا بھی آتے ہیں، اُس کی طرف اشارہ ہے) مگر انسان کبھی یہ نہیں کہتا کہ مال کی محبت کے لیے کام کر رہا ہوں۔ بلکہ یہی کہے گا کہ میں اللہ تعالیٰ کی محبت کے لیے یہ کام کر رہا ہوں۔ اگر انسانی فطرت کو درست کرنے کے لیے کام کیا جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کے لیے کام کرنا ہوتا ہے۔ اس کام کے کرنے میں تو انسان بہت سست ہے مگر اپنی شخصی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے (یعنے مال جمع کرنے کے لیے) بہت تیز ہے اور گھوڑوں سے بھی زیادہ تیز دوڑتا ہے۔ لوگوں سے کہتا ہے کہ میں مسکین محتاجوں کے کے لیے جمع کرتا ہوں۔ اس طرح اپنے عیب کو چھپاتا پھرتا ہے۔ غرض اُس کی یہ عادت بن گئی ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں کو چھپاتا ہے۔ وہ دنیا کو دکھاتا ہے کہ میں دین کی خاطر اپنے وطن اور قوم کے لیے کام کر رہا ہوں۔ حالانکہ حالت یہ ہے کہ وہ صرف دولت کے لیے کام کر رہا ہے، تو اس کی کمزوری کا اظہار ضرور ہونا چاہیے۔

آیت (۹) افلا يعلم إذا بعثر ما في القبور :- انسان کی اس کمزوری کا نتیجہ یہ ہے کہ اُسے قیامت میں لا کر کھڑا کر دیا جائے گا کہ اُس نے جس قدر اپنے عیب چھپائے تھے اُنہیں ننگا کر دیا جائے۔ قرآن مجید میں جو قیامت کا ذکر آتا ہے اُس کی یہی حکمت ہے۔

آیت (۱۰) حصل ما في الصدور :- اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان چونکہ اقرار نہیں کرتا کہ وہ مال کی محبت میں پھنسا ہوا ہے۔ اس واسطے کہا کہ انسان کے سینے میں جس قدر مخفی ارادے تھے۔ وہ سب ظاہر کر دیے جائیں گے تو اس وقت کیا یہ بات چھپی رہے گی؟ ہرگز نہیں۔

آیت (۱۱) إن ربهم بهم يومئذ لخبير :- جس طرح اُس دن تمام دنیا جان لے گی (اُس دن سے مراد قیامت ہے) اسی طرح اُن کا رب آج بھی اُن کو جان رہا ہے۔ عام تفسیروں میں یومئذ سے قیامت کا دن مراد لیا ہے اور یہ تفسیر غلط ہے۔ اُس دن (قیامت) کو تو تمام لوگ اُس کے عیب جان لیں گی تو اُس میں اللہ تعالیٰ کی خصوصیت بیان کرنے سے کیا فائدہ؟ اُس دن سے وہ دن مراد ہے جس دن (اِس دنیا میں) انسان اپنی کمزوری چھپاتا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ اُسے اچھی طرح جانتا تھا۔

حاصل مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن جس طرح تمام لوگ اس کی کمزوریوں کو جان لیں گے اسی طرح اللہ تعالیٰ آج بھی اُن کی کمزوریوں سے آگاہ ہے۔

101

# سُوْرَةُ القَارِعَة مَكِيَّة وهى احدٰے عشرة آية

سورہ قارعہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی گیارہ آیتیں ھیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان ، نہایت رحم والا ہے

اَلْقَارِعَةُ (۱) مَاالْقَارِعَةُ (۲) وَ مَآ اَدْرٰىكَ مَاالْقَارِعَةُ (۳)

وہ کھڑ کھڑا ڈالنے والی کیا ہے وہ کھڑ کھڑا ڈالنے والی اور تو کیا سمجھا کیا ہے وہ کھڑ کھڑا ڈالنے والی

يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ (۴) وَ تَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ

جس دن ہوویں لوگ جیسے پتنگے بکھرے ہوئے اور ہوویں پہاڑ جیسے رنگی ہوئی اون

الْمَنْفُوْشِ (۵) فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ (٦) فَهُوَ فِىْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ (۷)

دھنی ہوئی سو جس کی بھاری ہوئیں تولیں تو وہ رہے گا من مانتے گذران میں

وَ اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ (۸) فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (۹) وَ مَآ اَدْرٰىكَ مَاهِيَهْ (۱۰)

اور جس کی ہلکی ہوئیں تولیں تو اُس کا ٹھکانا گڑھا ہے اور تو کیا سمجھا وہ کیا ہے

نَارٌ حَامِيَةٌ (۱۱)

آگ ہے دہکتی ہوئی .

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم O

# سورة القارعة مکیة

سورة العادیات میں انسان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا ایک اصول نہیں رکھتا۔ وہ جب مجبور ہوتا ہے تو بعض چیزوں کا صحیح اعتراف کر لیتا ہے اور جہاں چھپانے کی جگہ مل گئی وہاں سچ کا اعتراف نہیں کرتا۔ اس سورت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ جو آدمی اپنی زندگی کو صحیح اصول پر مسلسل چلائے گا فقط وہی کامیاب ہو سکتا ہے۔ یہاں قیامت کا ایک نیا پہلو ذکر کیا گیا ہے۔

یہ بہت ہنگامہ خیز واقعہ ہے اور بعض انسان ایسے ہیں کہ اس ہنگامہ خیزی سے ان کے اصول پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بس یہی آدمی ہیں جو کامیاب ہوں گے.

آیت (۱) القارعة :- ہنگامہ خیز واقعہ.

آیت (۲) تا ۴) قاہرہ قوّتوں کا اس نظام پر اتنا اثر پڑے گا کہ انسان ایک پتنگے کی مانند چھوٹی سی چیز دکھائی دے گا اس نظام کے مقابلہ میں.

آیت (۵) و تکون الجبال الآیہ:- پہاڑ روئی کے گالے دکھائی دیں گے۔ جیسے بخارات اُڑ کر برف کے گالے پڑتے ہیں پہاڑ بھی بخار بننے کے بعد روئی کے گالے بن جائیں گے۔ گویا بڑا انقلاب پیدا کرنے والی قاہرہ حقیقتیں وہاں ظاہر ہوں گی.

آیت (۶ و ۷) فاما من ثقلت موازینہ الآیات :- جس کے اعمال زیادہ اچھے ہوں گے وہی آرام کی زندگی بسر کرے گا۔ یعنی جو اپنے اصول کو نہیں بدلے گا اور اپنے سچے اصولوں پر اٹل رہے گا وہی آرام سے رہے گا۔ دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے مگر اچھے اعمال والے اپنی بات سے اور اپنے اصول سے ہٹنے والے نہیں ہیں۔ یہ وہ اصول ہیں جو فطرت کے موافق ہیں اور حظیرة القدس کے ارادوں سے اُن میں زیادہ وزن آ گیا ہے۔

آیت (۸ تا ۱۰) و اما من خفت موازینہ الآیات :- جس آدمی کے کام بے اصول ہیں وہ آگ میں گر پڑے گا۔ حظیرة القدس میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ صحیح اصول کی پابندی آخرت میں جنت کی زندگی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور جس انسان کی بے اصولی زندگی ہے وہ جہنم کی زندگی میں تبدیل ہو جاتی ہے.

102

## سورۃ التکاثر مکیۃ وھی ثمان آیات

سورہ التکاثر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی آٹھ آیتیں ہیں

## بسم اللہ الرحمن الرحیم ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ (۱) حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (۲) كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ

غفلت میں رکھا تم کو بہتایت کی حرص نے یہاں تک کہ جا دیکھیں قبریں، کوئی نہیں آگے جان

ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۴) كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ (۵) لَتَرَ

پھر بھی کوئی نہیں آگے جان لوگے، کوئی نہیں اگر جانو تم یقین کرکے بے شک تم کو دیکھ

الْجَحِيْمَ (۶) ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ (۷) ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْ

ہے دوزخ پھر دیکھنا ہے اس کو یقین کی آنکھ سے پھر پوچھیں گے تم سے اس دن آرام کی

بسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ٥

# سورة التکاثر مکیة

آیت (۱ و ۲) الهکم التکاثر ٥ حتی زرتم المقابر:- زیادہ طلبی نے تمہیں اصل مقصد سے غافل کر دیا۔ انسان کو یہ شوق ہے کہ وہ زیادہ کام کرے۔ تو اس شوق میں زندگی بسر کر کے وہ قبر تک پہنچ جاتا ہے یعنی مر جاتا ہے۔ اِس جگہ سمجھایا گیا ہے کہ کام۔ زیادہ مطلوب نہیں ہے مگر جو ہو وہ ٹھیک طور پر ہو اور علمی طور پر ہو.

آیت (۳ و ۴) کلا سوف تعلمون ثم کلا الآیات:- تم جلدی جان لو گے کہ [illegible] کام کرنا بے کار ہے یعنی حرص و ہوس کے لیے کثرتِ کار مطلوب نہیں ہے.

آیت (۵ و ۶) کلا لو تعلمون علم الیقین ٥ لترون الجحیم:- ایسا کام کرو کہ جس سے تمہاری علمی قوت میں جلا پیدا ہو۔ جلا پیدا ہونے کے بعد یہ نتیجہ نکلے گا کہ انسان اِسی دنیا میں جہنم کو اپنے آنکھوں سے دیکھ لے گا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک ماہر ڈاکٹر بیماری کو ابتدا میں دیکھ کر اُس کی انتہا تک پہنچ جاتا ہے۔ ایسے ہی کام کی خوبی سوچنے والے انسان کی نظر کام کے انجام تک فوراً پہنچ جائے گی کہ اس کام کا نتیجہ جہنم ہے۔ اگر اِس طرح سوچ سمجھ کر کام کیا جائے تو انسانیت کے لیے بہت مفید ہے۔ کثرت کار مطلوب نہیں ہے.

آیت (۷) ثم لترونها عین الیقین:- تمہاری علمی قوت کی یہ جِلا ہے کہ تم جہنم کو اِس دنیا میں دیکھ لو گے اور آگے چل کر آخرت اپنے یقین کی آنکھ سے دیکھ لو گے۔

آیت (۸) ثم لتسئلن یومئذ عن النعیم:- اِس طریقہ کا علم تمہیں قرآن مجید سکھاتا ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں بتاتے ہیں۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمتیں ہیں۔ ان کی بڑی قدر کرو۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی دو بہت بڑی نعمتیں ہیں ایک تو قرآن مجید اور دوسرے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم۔ ان دونوں کی بڑی قدر کرو۔ یہ تفسیر امام جعفر صادق علیہ السلام نے کی ہے اور یہ تفسیر خاص لوگوں کی سمجھ کے موافق ہے۔ عام لوگوں کے لیے کھانا پینا اور دوسری دنیوی نعمتیں اِس آیت کی تفسیر میں بیان کی جا سکتی ہیں۔ قرآن مجید کی تعلیم سے قیامت کا ربط اِس سورت کا خلاصہ ہے.

# سُوْرَۃُ الْعَصرِ مَکِّیَّۃٌ وَّ هِیَ ثٰلٰث آیٰاتٍ

سورہ عصر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی تین آیتیں ہیں

103

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالْعَصْرِ (۱) اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ (۲) اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ

قسم ہے عصر کی، مقرر انسان ٹوٹے میں ہے مگر جو لوگ کہ یقین لائے اور کیے بھلے کـ

وَ تَوَاصَوْ بِالْحَقِّ ۙ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۳)

اور آپس میں تاکید کرتے رہے سچے دین کی اور آپس میں تاکید کرتے رہے تحمل کی.

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم O

# سورۃ العصر مکیۃ

سورۃ البینہ میں مرکزی جماعت کے متعلق اساسی خاکہ بیان کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد سورت زلزال میں اخلاق کی تہ کی خوبی پر توجہ دلائی گئی تھی۔ اچھی جماعت کبھی قائم نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے اخلاق کے اندر جو بنیادیں ہیں وہ اعلیٰ درجہ کی نہ ہوں.

سورت العادیات میں اخلاق کی صورت اور اعمال کی خوبی کی طرف اشارہ تھا اس کے بعد سورت القارعہ میں اعمال کو اخلاق سے مزیّن کرنے کی طرف اشارہ تھا۔ سورت بینہ کے بعد چار سورتیں آئیں ان میں اس مرکزی جماعت کے اساسی کاموں کی طرف اشارہ ہے کہ قیامت کے مختلف پہلو انسان کی ترقی کے لیے کیوں ضروری ہیں، ان سب کی تشریح یہاں ہو جاتی ہے.

سورت والعصر میں مرکزی جماعت کو تبدّل زمانہ سے اپنے پروگرام پر نظر ثانی کرنے کی جو ضرورت ہے اس کی طرف اشارہ ہے۔ جس طرح زمانہ آہستہ آہستہ بدلتا ہے اس کے مطابق مرکزی جماعت کو اپنی حالت درست کر لینی چاہیے۔ مگر جو اصلی بنیادی نظام ہے اس میں کوئی تبدیلی نہ آئے.

آیت (۱ و ۲) **والعصر O ان الانسان لفی خسر**:- والعصر کا ترجمہ ہے ہر زمانہ کا تبدّل یعنی بدلنے والا زمانہ جو آہستہ آہستہ بدلتا جاتا ہے۔ اور اپنے اثرات اور نچوڑ چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ یعنی تاریخ گواہ ہے کہ انسان اجتماعی طور پر ہمیشہ نقصان میں رہا ہے۔ صرف وہی جماعت کامیاب رہی جس کا ذکر آیت ۳ میں ہے.

آیت (۳) **الا الذین آمنوا**:- جس نے اپنی ترقی کے لیے صحیح نظریات قائم کر لیے یعنی اساسی نظریات صحیح اور تجربہ شدہ ہوں.

**و عملوا الصالحات**:- اور زمانہ کے مطابق اپنے نظریات کو عملی شکل پہنانے لگے.

**و تواصوا بالحق**:- اور جماعت بنائی جو اساسی نظریات پر مشترک ہے اور سب ایک دوسرے کو اس پر پختہ رہنے کی وصیت کرتے ہیں۔ وہ ایسی جماعت ہے جو سمجھتی ہے کہ میں تو پورا کام کر لوں لیکن جب تک میرا ساتھی پورا کام نہیں کرے گا میرا کام نکمّا اور ادھورا رہ جائے گا۔ اس لیے وہ انتہائی کوشش سے اپنے ساتھیوں کو توجّہ دلاتا ہے کہ اپنا فرض پورا کرو۔ یہ بات چونکہ ہر فرد میں پائی جاتی ہے اس واسطے جماعت کا ہر ایک فرد مساوات کی روح کا مجسمہ ہے۔ ایسے لوگوں کا نظام ہمیشہ قائم کرنے کے لیے چیرمین (Chairman) ہوتا ہے۔ پریزیڈنٹ نہیں ہوتا، اس لیے کہ چیرمین اساسی نظریات کی صحت پر یکساں یقین رکھتا ہے.

جب جماعت میں مختلف طبقات پیدا ہو جائیں، یعنی کچھ تو اعلیٰ درجہ کے

لوگ ھوں اور کچھہ دوسرے درجہ کے، تو ایسی حالت میں نظام قائم نہیں رہ سکتا
جب تک کہ اعلیٰ جماعت میں سے ایک آدمی کو پریزیڈنٹ نہ بنا دیا جائے۔

و تواصوا بالصبر:- اور وہ سب لوگ ایک دوسرے کے لیے انتہائی توجہ سے
کوشش کرتے ھیں کہ اس راستہ میں جس قدر مشکلات پیش آ رھی ھیں آن کو ھمت
سے برداشت کرنا چاھیے۔ یعنی کسی مشکل کی وجہ سے ان کی پیش قدمی نہیں رکتی۔

ھر زمانہ کی تاریخ گواہ ھے کہ اس قسم کی منظّم جماعتوں کے سوا کبھی کوئی
آدمی انفرادی طور پر کامیاب نہیں ھوا اور یہ مسئلہ تاریخ سے تعلق رکھتا ھے۔ اس پر
انسان آسانی سے یقین کر سکتا ھے کیوں کہ تاریخ اپنے واقعات محفوظ رکھتی ھے اور
آن کو دھراتی رھتی ھے۔

## سورۃ الھمزۃ مکیۃ وھی تسع آیات

104

سورہ ھمزہ مکہ میں نازل ھوئی اور اس کی نو آیتیں ھیں

### بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ھے

وَیْلٌ لِّکُلِّ ھُمَزَۃٍ لُّمَزَۃِ (۱) نِالَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَہٗ (۲) یَحْسَبُ اَنَّ مَالَہٗ

خرابی ھے ھر طعنہ دینے والے عیب چننے والے کی جس نے سمیٹا مال اور گن گن کر رکھا خیال رکھتا ھے کہ آس کا

اَخْلَدَہٗ (۳) کَلَّا لَیُنْۢبَذَنَّ فِی الْحُطَمَۃِ (۴) وَ مَآ اَدْرٰکَ مَا الْحُطَمَۃُ (۵)

سدا کو رھے گا آس کے ساتھہ، کوئی نہیں وہ پھینکا جائے گا آس روندنے والی میں اور تو کیا سمجھا کون ھے وہ

نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ (٦) الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ (۷) اِنَّھَا عَلَیْھِمْ مُّؤْصَدَۃٌ (۸)

روندنے والی، ایک آگ ھے اللہ کی سلگائی ھوئی وہ جھانک لیتی ھے دل کو آن کو آس میں موند دیا ھے

فِیْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَۃٍ (۹)

لمبے لمبے ستونوں میں۔

بسم اللہ الرحمان الرحیم O

# سورۃ الھمزہ مکیۃ

جماعتوں کی ایک خرابی ہے سرمایہ داری۔ جہاں ایسا گروپ پیدا ہو جائے جو سرمایہ ہی کو سب کچھ سمجھے تو جماعت برباد ہو جاتی ہے۔ اِس سورت میں فقط سرمایہ داری کے عیوب دکھلائے گئے ہیں کہ اس سے انسان کے اخلاق کس طرح برباد ہو جاتے ہیں اور دنیا اور آخرت میں ایسے شخص سے زیادہ تباہ حال کوئی انسان نہیں ہوتا۔ اگر کوئی مصلح ان کے پاس جاتا ہے تو اس کے وہ عیب نکالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم کس طرح لوگوں کی اصلاح کر سکتے ہو، تم نادار ہو۔ تم میں تو یہ عیب ہے اور پس پشت بھی ایسے لوگوں کی عیب جوئی کرتا ہے۔ وہ محض اپنے سرمایہ کی حفاظت کے لیے نکتہ چینی کرتا ہے۔

آیت (۱) **ویل لکل ھمزۃ لمزۃ**:- وہ آدمی جس نے اپنی فطرت ہی یہ بنالی ہے کہ وہ ہر آدمی پر طعن اور نکتہ چینی کرتا ہے اُس کے سامنے اگر کوئی بہترین آدمی بھی آتا ہے تو اُس میں بھی وہ نقص نکالتا ہے۔ اُس پر افسوس ہے اور یہ اخلاقی موت ہے۔ غرض یہ شخص ہر چیز میں برائی ہی برائی دیکھتا ہے۔ اس کے بعد اس کی زندگی حیوانوں کی طرح ہو جاتی ہے۔ انسان کی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی خوبی کے متعلق اپنا نظریہ ٹھیک بنائے اور اس کے بعد جس قدر خوبی ممکن ہو سکے اپنے اندر پیدا کر دکھائے۔ مگر اس آدمی کی تو یہ حالت ہے کہ اس کے دماغ میں کسی خوبی کا نظریہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ وہ ہر چیز میں برائی دیکھتا ہے۔ اب اس کا سبب بتایا جاتا ہے کہ اس میں یہ خرابی کیوں پیدا ہوئی۔ وہ سبب یہ ہے کہ:-

آیت (۲) **الذی جمع مالاً و عددہ**:- وہ مال جمع کرتا ہے اور پھر اُسے گن گن کر رکھتا ہے۔ اس کی وجہ سے اس کی اخلاقی خوبی کم ہو گئی ہے۔

آیت (۳) **یحسب ان مالہ اخلدہ**:- پیسہ گن گن کر رکھنے کے بعد اُس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اُس کا مال ہمیشہ رہے گا۔ یعنی اس کی ہر ایک ضرورت مال ہی سے پوری ہوتی رہے گی۔ یہ طبعی بات ہے کہ بعض کام تو واقعی مال ہی سے پورے ہوتے ہیں۔ مگر انسان کی بعض ضرورتیں ایسی بھی ہیں جن کے لیے علم و

اخلاق چاهیے - ورنہ اس آدمی پر لوگ اعتبار نہیں کرتے - اور یہ بات کہ هر ضرورت
مال سے هی پوری هوتی هے اخلاقی حصہ کی لغویت کو ظاهر کر دیتی هے - بات دراصل
یہ هے کہ جس شخص کے پاس اصول هی نہ رهے تو اب اس کا کام یہی هے کہ لوگوں
پر طعن و تشنیع کرتا پھرے.

یہ سرمایہ داروں کی عادت هے کہ جب اپنی مجلس میں بیٹھتے هیں تو ایک مصلح
ریفارمر اور لیڈر کی تشنیع شروع کر دیتے هیں کہ یہ اصلاح کرتا پھرتا هے، پیسہ
پیسہ تو اس کے پاس نہیں هے - مال کے سوا کیسے تدبیریں چلتی هیں - دوسرا کہتا
هے کہ اس نے اپنے پیٹ کے لیے ایک جال بنا رکھا هے - تیسرا سرمایہ دار کہتا هے کہ
اس میں فلاں فلاں عیب موجود هیں اور یہ اپنی اصلاح تو کرتا نہیں - کوئی کہتا هے
کہ اس کی شکل بھی بُری هے - اگر اس میں کوئی جوهر هوتا تو اس کی شکل منحوس نہ هوتی
اور یہ کہ اس کے خویش و اقارب میں بھی بری عادتیں هیں - اسی طرح سے عیب گنتے
رهیں گے اور آخر میں کہیں گے کہ یہ ٹھیک هے کہ بس پیسہ کماؤ اور کھاؤ - ان
ان کے هاں یہ خیال هے کہ جائز اور ناجائز طریقہ سے مساکین کو لوٹو اور کھاؤ - اس
کی مثال یوں هے کہ گویا بڑی مچھلی چھوٹی مچھلیوں کو کھا جاتی هے - ان سرمایہ داروں
میں نہ رحم هے، نہ اخلاق - گویا اس طعن و تشنیع کا سبب صرف سرمایہ داری هے

اس قسم کے آدمی کی سوسائٹی میں جو بری حالت هوتی هے اس کے بیان کرنے
کی ضرورت نہیں هے - آخرت میں اس کو جو تکلیف پیش آئے گی اس کی توضیح سورۃ
کے آخر میں کر دی جائے گی.

آیت (۴ تا ٦) کلا لینبذن فی الحطمة وما ادراك ما الحطمه نار الله الموقدہ :-
آگ میں ڈالا جائے گا جو اس کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے گی.

آیت (۷) التی تطلع علی الافئدہ :- اب بتلایا جاتا هے کہ وہ آگ کیا هے؟
آگ ایسی هے جو دلوں سے طلوع کرتی هے - تمام متمدن قوموں میں عموماً دل کو
مرکزِ اخلاق سمجھا جاتا هے تو جب دل یعنی مرکزِ اخلاق میں خرابی پیدا هوگئی
تو اس کے باعث دل میں آگ پیدا هوگئی - انسانی بدن کے اگر کسی حصہ کو تکلیف
پہنچے تو تمام بدن میں آگ (جلن) سی محسوس هوتی هے - اور یہ ایک چھوٹا سا
مظاهرہ هے - مگر جب مرکز اخلاق یعنی دل میں خرابی پیدا هو جائے تو اس سے جو
بے چینی پیدا هوگی اس کا یہاں (اس دنیا میں) صحیح تصور بھی نہیں کیا جا سکتا
مثال کے طور پر ایک آدمی کسی پر عاشق هو جائے اور اس عشق میں اس کی محبت
بڑھتی چلی جاتی هے اور اسے معشوق نہیں ملتا تو اسے آگ کی سوزش جیسی تکلیف
محسوس هونے لگتی هے - بس اس قسم کی محبت سرمایہ دار نے روپیہ پیسہ (مال) سے

پیدا کر لی ہے۔ اور جب اس آدمی کو آگ میں ڈالا جائے گا تو اگر اس کے اخلاق اچھے ہیں تو وہ آگ اسے کچھ نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ بہرحال قرآن مجید میں دوزخ کی یہ توضیح ہو جاتی ہے کہ انسان کی بد اخلاقیوں سے وہ آگ پیدا ہوتی ہے۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ انسان کو جو بخار آتا ہے وہ دوزخ کا نمونہ ہے۔ گویا بخار اندر سے طبیعت کی خرابی سے پیدا ہوتا ہے اور باہر سے نہیں آتا۔

آیت (۸ و ۹) انها عليهم موصدة فی عمد ممددة :- وہاں ایک آگ باہر سے بھی آتی ہے اب اس کا ذکر ہے۔

گرم ممالک میں دوپہر کے وقت سخت گرمی ہوتی ہے اور یہ قدرتی چیز ہے۔ اب اگر ایک بخار والے آدمی کو ایسی زمین سے گذرنا پڑے جہاں شدت سے دوپہر کی گرمی ہے تو اس آدمی کو خواہ مخواہ تکلیف زیادہ ہو جائے گی۔ مگر یہ جو اسے تکلیف ہو رہی ہے اس کا سبب اس کی اندرونی خرابی ہے۔ اگر یہ تندرست ہوتا تو اس کو گرمی کی وجہ سے معمولی سی تکلیف ہوتی اور یہ گذر جاتی مگر چونکہ اس کے اندر خرابی ہے اس واسطے وہ سخت تکلیف اٹھا رہا ہے۔ اسی طرح جہنم ہے۔ وہاں اگر کوئی با اخلاق آدمی گذر جائے تو اسے جہنم کی آگ محسوس بھی نہ ہوگی۔ اگر ایسا آدمی وہاں سے گذرے جس کے اندر اخلاقی خرابی ہو تو اس کے لیے اس کی طبیعت میں بہت تکلیف کا اضافہ ہو جائے گا۔

اس سورت میں جماعت میں سرمایہ داری کو روکنے کے لیے اخلاقی نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے۔ اور اخلاق کا اچھا رکھنا انسان کا فطری تقاضا ہے۔

# سورۃ الفیل مکیۃ وھی خمس آیات

سورہ فیل مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی آٹھ آیتیں ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

/05

اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ (۱) اَلَمْ یَجْعَلْ کَیْدَھُمْ فِیْ

کیا تونے نہ دیکھا کیسا کیا تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ، کیا نہیں کر دیا اُن کا داؤ

تَضْلِیْلٍ (۲) وَّ اَرْسَلَ عَلَیْھِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ (۳) تَرْمِیْھِمْ بِحِجَارَۃٍ مِّنْ

غلط اور بھیجے اُن پر اُڑتے جانور ٹکڑیاں ٹکڑیاں پھینکتے تھے اُن پر پتھریاں

سِجِّیْلٍ (۴) فَجَعَلَھُمْ کَعَصْفٍ مَّاْکُوْلٍ (۵)

کنکر کی پھر کر ڈالا اُن کو جیسے بھس کھایا ہوا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# سورۃ الفیل مکیۃ

عربوں میں قریش دراصل ایک حکمران جماعت تھی۔ عرب سردار اُن کے فیصلے کو شہنشاہ کا فیصلہ تسلیم کرتے تھے۔ لیکن قریش عرب کے اندرونی جھگڑے سے تنگ آکر ایک جماعت چاہتی تھی کہ عرب کو شام سے ملحق کر دیا جائے اور اپنی تجارت محفوظ کر دی جائے تاکہ اُن سے روما کی حکومت محصول نہ لے سکے۔ دوسری جماعت چاہتی تھی کہ عرب کو ایران سے ملحق کر دیا جائے لیکن ایک تیسری جماعت اپنی خود مختاری قائم رکھنا چاہتی تھی۔ اُنہی میں ابوبکر صدیق رضہ عشرہ مبشرہ اور عتبہ وغیرہ تھے۔ جب قرآن شریف نازل ہونے لگا اور آن کو اتحاد کی دعوت دینے لگا تو آزادی پسند کہنے لگے کہ مبادا یہ کسی دوسری سلطنت کا حامی اور وکیل ہے اور ملک کو دوسرے کے سپرد کر دینے والا ہے۔ یلحدون الیہ اعجمی وھذہ عربی مبین اور اس قسم کی دوسری آیات کا یہی محمل ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے کچھ عربوں نے ایرانی حکومت سے ساز باز شروع کیا تھا اور بہت سے عرب قبائلی ان سے مل گئے تھے۔ مگر حجاز اپنی حالت پر مستقیم رہا۔ اس لیے روما کی حکومت کو خوف ہوا کہ مبادا قریش ایران سے سازباز رکھیں۔ اس لیے آن کے استیصال کی تجویزیں کر رہے تھے کہ گرجا کا حادثہ پیش آیا مگر معاملہ برعکس ہوا۔ اس سے قریش کی تجارت کو بڑا فروغ ہوا۔ شام اور عراق کے سردار آن کی بڑی عزت کرنے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سعادت سے پچاس روز قبل واقعہ فیل ہوا:- ع "پس از گذشتن پنجاہ روز عام الفیل" *

جماعت میں پہلی خرابی سرمایہ داری کی تھی (سورۃ الھمزہ) اور دوسری خرابی یہ ہے کہ انسان اپنے اوپر اعتماد کر کے ضعیفوں کو دبائے۔ اس سے امپریلزم پیدا ہوتی ہے۔ اِس سورت میں امپیریلزم کی تباھی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

واقعہ یوں ہے کہ حجاز کے کسی آدمی نے شاھی گرجا (یمن) میں نجاست پھینک دی۔ اس کا صحیح علاج یہ تھا کہ وہ آدمی (ملزم) اھل حجاز سے طلب کر لیا جاتا۔

---

* قصیدۂ عظمی۔ مصنفہ امین الدین شاگرد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی.

اور اس کے واسطے جتنی سزا ہوتی وہ دی جاتی - اور اگر اس کے ساتھ اس سازش میں
کوئی جماعت شریک تھی تو اس کو بھی پوری سزا دی جاتی - اہل حجاز اگر ایسے
آدمی یا جماعت کو جرم کے باوجود حکومت یمن کے حوالے نہ کرتے تو تمام حجاز پر
چڑھائی ہو سکتی تھی - مگر یمن کی حکومت نے انصاف اور تحقیق کا کوئی درجہ
ملحوظ نہیں رکھا - اس نے اپنی طاقت کے گھمنڈ پر حجاز کے معبد (بیت اللہ) کو گرانے
کے لیے چڑھائی کر دی - وہ بہت ساز و سامان وغیرہ اپنے ساتھ لائے جس میں ہاتھی
بھی تھے - ہاتھی عرب میں نہیں ہوتے اس لیے عربوں کو ڈرانے کے لیے ہاتھی
لائے تھے .

یہ واقعہ اس سال کا ہے جس سال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے - تو یہ
ایک قومی تاریخی واقعہ نزدیک کا ہے - اس کی وہی مثال ہے جیسے کہ ہندستان میں
۱۸۵۷ء کی جنگ جس کو ہندستانیوں کے بزرگ جانتے ہیں - میرے استاد دہلی کے
جان گداز واقعہ کے کئی برس بعد پیدا ہوئے مگر ان کا علم ایسا تھا کہ گویا وہ یہ
واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے - اس لیے کہ اس واقعہ سے تمام قوم پر مصیبت
چھا گئی تھی - اس طرح عرب کا یہ واقعہ نزدیک کا تھا - اب جو لوگ اس واقعہ سے
انکار کریں ان کی عقل پر ہنسی آتی ہے .

آیت (۱) الم تر کیف فعل ربك باصحاب الفیل :- ایک زورآور طاقت جو غریبوں
کو کچلنے کے لیے آئی تھی ، اسے کس طرح کچل دیا گیا؟

آیت (۲) الم یجعل کیدھم* فی تضلیل :- کیا ان کی تدبیروں کو ہم نے غلط

---

* روما کی حکومت جو یورپ کی حکومت تھی چاہتی تھی کہ حجاز پر ہماری سلطنت
ہو جائے تو ہندوستان کا راستہ صاف ہو جائے گا - ہندوستان دراصل ایرانی سلطنت
کا ایک صوبہ تھا اور وہ نہ چاہتا تھا کہ یورپ کو راستہ دیا جائے - یورپ نے
مذہبی تبلیغ سے حبشہ کو تابع کر لیا اور عرب قبائل میں بھی زور شور سے تبلیغ
شروع کردی تاکہ اس طریقہ سے حجاز اسے مل جائے - یورپ کے اشارہ پر حبشہ نے
کچھ حصہ یمن کا لے لیا اور کچھ حصہ ایرانیوں کے ہاتھ چلا گیا - اس صورت
میں فتح اس کی ہو سکتی تھی جس کی طرف حجاز ہو جائے - حجاز میں ایک طبقہ
تھا جو رومی سلطنت کو پسند کرتا تھا مگر ان کو خوف تھا کہ ہماری تجارت
پر محصول لگایا جائے گا - اور آزاد منش قریش اپنی حکومت کے دلدادہ تھے - جب
کوئی ان پر حملہ کرتا تو کہتے تھے کہ میراث خلیل یعنی کعبہ پر دھاوا پڑ رہا
ہے - پھر تو سارا عرب جمع ہو جاتا تھا - اس لیے زبردستی گھسنا حجاز میں تقریباً
محال تھا - اس کے لیے یورپ والے کوئی تدبیر سوچ رہے تھے کہ گرجا میں گندگی
کا واقعہ ہوا تو یورپ کی امداد سے حبشہ نے حجاز پر چڑھائی کی - مطلب یہ تھا

( باقی فوٹ نوٹ صفحہ ۱۷۳ پر دیکھو )

راستہ پر نہیں ڈالا؟ اگر یہ حقیقی مجرموں کو سزا دینے کی کوشش کرتے تو کامیاب ہو جاتے بلکہ خود حجاز کے با اختیار لوگ مجرموں کو ریگستانوں اور گوشوں سے تلاش کر کے نکال لیتے مگر اہل یمن کو تو انصاف اور حق کا خیال تک نہ تھا۔ ایک مقدس با برکت عمارت جس کے ساتھ تاریخی عظمت کی سیکڑوں روایات وابستہ تھیں، اُس کو گرانا اور اُس کی بے عزتی اور توہین کرنا اُن کے پیش نظر تھا اور بس۔ یہ ہے اُن کی تدبیر کو غلط راستے پر ڈالنا۔ یعنی وہ مقدس چیز سے ٹکرانے لگے اور سیدھا راستہ جو مجرموں کو سزا دینے کا تھا وہ بھول گئے۔ اب مقدس گھر کے مالک سے اُن کی ٹکر ہو گئی۔ اگر وہ انصاف کی طرف توجہ کرتے اور اُن آدمیوں کو طلب کرتے جنہوں نے جرم کیا تھا تو تمام مجرم اہلِ یمن کو دے جاتے مگر اُنہوں نے غلط راستہ اختیار کیا۔ اور خفیہ تدبیر (کید) یہ تھی کہ قریش لڑیں گے تو اُن کا استیصال کیا جائے گا۔ اِس طرح عرب میں حکومت روما قائم ہو جائے گی۔

آیت (۳) و ارسل علیہم طیراً ابابیل :- اتفاق ایسا ہے کہ ہندوستان میں ابابیل ایک چھوٹے سے پرندے کو کہتے ہیں۔ اور عربی میں ابابیل پرندوں کے جھنڈ کو کہتے ہیں۔ وہ پرندے تھے جھنڈ کے جھنڈ جو اس موقع پر آ گئے تھے۔

آیت (۴) ترمیہم بحجارۃ من سجیل :- اُنہوں نے چھوٹے چھوٹے روڑے (پتھر) اہل یمن کو مارے۔ ان پرندوں نے اہل مکہ کی رہنمائی کی کہ اہل یمن کے ساتھ اس طرح لڑو یعنی اس طرح پتھر مارو۔ اہل مکہ نے جس قدر ممکن ہو سکا پہاڑوں پر چڑھ کر پتھر پھینکے۔ اہل یمن کے لیے دُہری مصیبت تھی کہ ایک تو پرندے روڑے مار رہے تھے، دوم اہل مکہ بھاری بھاری پتھر مار رہے تھے۔

اہل مکہ کا پتھر پھینکنا قرآن شریف سے کسی طرح ثابت کرنا مشکل ہے

آیت (۵) فجعلہم کعصف ماکول :- وہ پتھروں کی مار سے ایسے ہو گئے کہ سیدھے طور پر اُٹھ بھی نہیں سکتے تھے یعنی روندے گئے۔ پرندوں کے پتھر پھینکنے سے وہ مدھوش ہو گئے۔ ادھر جماعت قریش نے اُن کو پتھر مارے تو ایسے ہو گئے جیسے تباہ شدہ گھاس۔ ہزیمت یافتہ لشکر کو اہل عرب ایسی ہی مثال سے یاد کرتے ہیں

---

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷۲ سے آگے)

کہ قریش اپنے بیت اللہ کو گرانے نہ دیں گے اور لڑیں گے تو مارے جائیں گے یعنی بیت اللہ کا گرانا مقصود بالذات نہ تھا بلکہ قریش کی بیخ کنی مقصود تھی۔ یہ تھی خفیہ تدبیر جس کو کید کہا گیا ہے۔ اللہ کی تدبیر یوں ہوتی ہے کہ بیت اللہ کی عزت بھی برقرار رہی اور قریش کی عظمت بھی قائم۔ ثقیف قبیلہ کو حبش نے رشوت دے کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا اس لیے اب فقط قریش رہ گئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے امداد دی۔

کہ گویا کوئی جانور گھاس کھا کر اِدھر اُدھر پھینک دے۔ اِسی طرح یہ لشکر ہوا کوئی کہیں مرا کوئی کہیں.

فطرت الٰہی میں ایسے بے نظیر واقعات بہت ملتے ہیں کہ جب ایک کمزور پر ظلم ہوتا ہو تو ایک حیوان اُس کی مدد کو پہنچ جاتا ہے۔ ہم اس نظام کا تعین نہیں کر سکتے کہ وہ حیوان کس طرح مدد کے لیے آ پہنچتے ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ تمام قوموں میں ایسے بے انتہا واقعات ملتے ہیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ مثلاً یہ کہ ایک عفت دار عورت جنگل میں تن تنہا جا رہی ہے اور کوئی آدمی اُس کی عصمت دری کرنا چاھتا ہے تو سانپ اُس کے پاؤں میں آ کر لپٹتا ہے اور اُس کا کام تمام کر دیتا ہے۔ کوئی طبعیات کا عالم ان واقعات کا انکار نہیں کر سکتا۔ اور الٰہیات میں تو یہ مسلّم بات ہے کہ ملاءِ سافل مدد کے لیے نمونہ بن کر آتے ہیں۔ بعض اوقات ملاءِ اعلیٰ سے برقی رو کی طرح مدد آجاتی ہے۔ ہم طبعیات کے علماء کو اس طرف توجہ دلاتے ہیں کہ واقعہ یوں ہوا، اب توجیہ تم کرو۔ مثلاً ایک سانپ بچّے کو کاٹنے کے لیے آتا ہے اُس پر کتّا حملہ کر کے اُس کو کاٹ کھاتا ہے۔ اب اِس جگہ اِس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ اُسے طبعیات کے ذریعے حل کیا جائے کہ یہ کیسے ہوا؟ اور نہ اِس جگہ کوئی عجوبہ چیز بتلانی مقصود ہے بلکہ دکھانا یہ ہے کہ ظلم کسی صورت میں برداشت نہیں کیا جا سکتا اور مظلوم کے بچانے کے لیے قدرت کوئی نہ کوئی انتظام کر دیتی ہے.

الٰہیات میں تو اس کی حکمت ملتی ہے کہ فرشتے جو کام کر رہے ہیں وہ اس کی تدبیر الہام کے ذریعے انسان کے دل میں ڈال دیتے ہیں اور اس کے بعد انسان خود تدبیر کر لیتا ہے۔ اس قسم کی سیکڑوں مثالیں ملتی ہیں.

ہمارے مفسرین نے قسم کھا رکھی ہے کہ جہاں کہیں قدرت الٰہی کا کوئی کرشمہ نظر آئے وہ اسے طبعی قوتوں سے بالکل خالی کر کے محض روحانی اثرات کا نتیجہ بتلائیں گے اور یہ غلط فلسفہ ہے۔ روحانی قوتیں جب اِس عالم جسمانی میں اپنا کام کرنا چاھتی ہیں تو جسمانی قوتوں کو کام میں لاتی ہیں۔ اس کی مثال خود انسان کا وجود ہے۔ مثلاً انسانی دماغ میں ایک خطرہ پیدا ہوتا ہے یہ روحانی چیز ہے۔ انسانی بدن اس کی تکمیل کے لیے پوری توجہ سے کام کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی روحانی طاقت اس زمین میں اپنا اثر کرنا چاھتی ہے تو وھاں کے قرب و جوار میں جو طبعی قوت جلدی کام کرنے والی ہوگی روحانی قوت اس پر اپنا اثر ڈالنا چاھے گی.

مکہ کے لوگ جو ضعیف اور مجبور تھے اُن کی عقل میں بھی نہیں آتا تھا کہ اس قسم کے جابر بادشاہ سے کس طرح مقابلہ کریں گے۔ اُن کے سردار نے حکم دیا کہ تم

اِس جابر بادشاہ سے مقابلہ نہ کرو بلکہ پہاڑوں پر چڑھ جاؤ۔ وہ اس سے زیادہ اپنا بچاؤ نہیں سوچ سکتے تھے۔ اب اُن کی رہنمائی کے لیے چند پرندے ظاہر ہوئے۔ ہم نے جو فرض کر لیا ھے کہ وہ چھوٹے چھوٹے پرندے تھے اور چھوٹی چھوٹی کنکریاں اُن کے منہ میں تھیں یہ غلط ھے۔ وہ بڑے بڑے پرندے (مثل گدھ) تھے اور اُنھوں نے دور سے پتھر پھینکنے شروع کیے۔ جب یہ پتھر اہلِ یمن پر پڑے اور برسات کی طرح اُن پر برسنے لگے تو اُن کی صفوں میں ابتری پیدا ہو گئی۔ اور وہ پریشان ہوگئے کہ یہ کیا ہو رہا ھے۔ عرب میں بیت‌اللہ کی تقدیس اس فطرت کے درجہ پر پہنچی ہوئی تھی، تو اُن کو خوف ہونے لگا کہ یہ عذاب الٰہی ھے۔ اس خوف سے ان کے دلوں میں دھشت سما گئی۔ اہل یمن بھی اس بیت‌اللہ کو ابتدا سے مقدس جانتے تھے۔ یہ تحریک یعنی اس کی بے عزتی کی تحریک حبش کے نصرانیوں کی تھی۔ اس تحریک میں تو یمن والے مجبوراً داخل ہوئے تھے لیکن پھر وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور یمن کے لوگ جب بھاگے تو تمام لشکر میں آدھم مچ گیا۔ اب حبش کے لوگوں میں بھی پریشانی پھیل گئی۔ کیوں کہ حبش کے لوگ نصرانیت سے پہلے بیت‌اللہ کا حج کرتے تھے۔

اہل یمن کی فوج میں فیل تھے۔ اُنھوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس لیے کہ ھاتھیوں پر اوپر سے پتھر برس رہے تھے اور عرب کی گرمی نے اُن کا دماغ پریشان کر دیا تھا۔ اہل مکہ نے جب پہاڑوں پر سے دیکھا کہ ان پتھروں سے دشمن کی فوج میں اب ابتری پھیل گئی ھے تو اُنھیں ھمت اور جرأت پیدا ہوگئی۔ اُنھوں نے پہاڑوں سے پتھر پھینکنے شروع کردیے اور اہل یمن کو بھس بنا کر رکھ دیا۔

سرسید نے اس کی تاویل کی ھے کہ یہ چیچک* کے جراثیم تھے۔ سرسید ایک حکیم عالم تھے اور وہ اس لطیفہ بازی سے اپنے نوجوانوں کو قرآن کی طرف متوجہ رکھنا چاھتے تھے۔ ان کی غرض صرف اس قدر تھی اور بس۔ اب عربوں نے سرسید کی ایسی بات کو عربی میں ترجمہ کر دیا اور یورپ میں پیش کر کے پھولے نہیں سمائے۔ سرسید کی علمی و عملی تحریک میں سمجھدار آدمی کے لیے چند نقص نمایاں معلوم ہوتے تھے۔ اس کے متعلق جب کبھی سرسید سے سوال کیا گیا تو انھوں نے اس کا جواب دینے سے گریز کیا۔ ان کا ایک سہل سا لطیفہ ھے کہ جب تالاب بھر جائے گا تو پانی باھر نکلنے کے لیے اپنا راستہ خود تلاش کر لے گا۔

سرسید اپنے نوجوانوں کو یورپین سائنس سے تعارف کرانا چاھتے تھے۔ اُن کو اعتماد تھا کہ جو غلطیاں رہ جائیں گی اُن کو ھمارے نوجوان خود درست کر لیں گے۔ ھم اس بڑے آدمی (سرسید) کی نیک نیتی کا ثمرہ اپنے آنکھوں سے دیکھ چکے ھیں۔

---

* محمد علی قادیانی نے بھی قرآن شریف کے انگریزی ترجمے میں ابابیل کا یہی ترجمہ کیا ھے۔ مرتّب۔

سرسید نے موسیٰ علیہ السلام کے سمندر سے گزرنے کے واقعہ کی تفسیر جوار بھاٹا اور مد و جزر کے ذریعہ کر دی۔ یہ ایک مہمل سی تفسیر ہے۔ مگر کالج اور اسکول کے پڑھنے والے طلبہ کے لیے (جن کو دینیات کا زیادہ علم نہیں ہے) یہ ایک عجیب اور نادر تفسیر ہے۔ ایک عالم نے کالج کے انڈر گریجویٹ (عبدالقادر خان جو آج کل کراچی میں امیرالحجاج ہے) سے سرسید کی نسبت کہا کہ جو آدمی سرسید کی کتابیں پڑھتا ہے وہ مسلمان نہیں رہتا۔ اس نوجوان نے جواب دیا کہ یہ صحیح ہے کہ وہ مسلمان نہیں رہتا مگر وہ عیسائی بھی نہیں ہوتا.

سرسید کی تفسیر کو پڑھ کر کالج کے مولوی حمیدالدین صاحب مرحوم نکلے ہیں علی گڑھ کے بی۔ اے ہیں۔ انہوں نے قرآن کی تفسیر عربی میں لکھی اور اس واقعہ کی تفسیر نیچرل قواعد کے ذریعہ کی ہے کہ دنیا عش عش کرنے لگی۔ موسیٰ علیہ السلام کا سمندر سے گزرنا دنیا کی تین بڑی قومیں مانتی ہیں۔ یہود، نصاریٰ اور مسلمانوں کے ہاں یہ واقعہ مسلّم ہے۔ سائنس کے اعتراضات تمام دنیا کو پریشان کر رہے ہیں مگر ہمارا خیال ہے کہ سائنٹفک طریقہ سے مولوی حمیدالدین سے بڑھ کر نوجوانوں کو کوئی نہیں سمجھ سکا۔ مطلب یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو پریشان نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ ان کی تاریخ بڑی شاندار ہے۔ انہیں ہر فن کے عالم اول درجہ کے ان کی اپنی قوم میں ملیں گے۔ وہ محققانہ طور پر آگے بڑھ سکتے ہیں اور ہر مقصد کے لیے اپنے گھر ہندوستان ہی سے ہر ایک چیز حاصل کر سکتے ہیں.

اِس سورت کی یہی روح تھی کہ اگر کوئی امپیریلزم (شاہنشاہیت) کسی کمزور کو دبانے پر مستعد ہو جائے تو قدرت ایسے سامان پیدا کردے گی جو اس طاقت کو برباد کر دیں گے۔ اس واسطے مسلمانوں کو شہنشاہیت سے پاک رہنا چاہیے اور کمزوروں کو نہ دبائیں.

اس سورت میں اشارۃً قرآن مجید کی تعلیم کا مرکز بیت اللہ ظاہر کر دیا گیا ہے۔ اب اگلی سورت میں اس کی تصریح کر دی جائے گی.

عبدالمطلب کے نہ لڑنے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ تاجر لوگ اگر فتح کرتے تو یمن کی تجارت بند ہو جاتی۔ اگر مغلوب ہوتے تو نادان حبشی ان کی بیخ و بنیاد اکھاڑ کر رکھ دیتے اور مکہ مکرمہ کو ایسا ویران کر دیتے کہ اس میں کوئی آ کر نہ بستا اور پروپیگنڈا کرتے رہتے کہ ہم نے بتوں کا مندر رضائے الٰہی کے لیے توڑا اور یہ حجاز لینے کی سیاسی چال تھی.

106

## سُوْرَۃ القریش مَکّیۃ وَھی اَربَع آیۃٍ

سورہ قریش مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چار آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان ، نہایت رحم والا ہے

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ (١) اٖلٰفِھِمْ رِحْلَۃَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ (٢) فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ

اس واسطے کہ مانوس رکھا قریش کو مانوس رکھنا اُن کو سفر سے جاڑے کے اور گرمی کے تو چاہیے کہ بندگی

١ ع ٣١ ھٰذَا الْبَیْتِ (٣) الَّذِیْٓ اَطْعَمَھُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۵ وَّ اٰمَنَھُمْ مِّنْ خَوْفٍ (٤)

کریں اس گھر کے رب کی جس نے ان کو کھانا دیا بھوک میں اور امن دیا ڈر میں ۔

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیمo

# سورۃ القریش مکیۃ

اصحاب الفیل کے واقعہ کے بعد حجاز، یمن اور شام میں قریش کی بڑی عزت ہو گئی کہ یہ جماعت خدام بیت‌اللہ ہے جس کی حفاظت خود خدا کرنے والا ہے۔ اُمراء عرب کو ایسے کرشموں سے جو قوموں پر نازل ہوتے ہیں بہت تعجب اور خوف ہوتا ہے اور غرباء تو غلام بن جاتے ہیں تو اس واقعہ نے قریش میں دو باتیں پیدا کر دیں۔ ایک تو ان کو تجارت میں سہولت ہو گئی۔ شام اور یمن کے بادشاہ جو نصرانی تھے اس واقعہ کے بعد انہوں نے اِن کی تجارت سے ٹیکس وصول کرنا چھوڑ دیا۔ پھر ان کے دل میں بھی سلطنت کے لیے وسوسے پیدا ہونے شروع ہو گئے کہ ہم میں تو اتنی طاقت ہے کہ ہم دوسروں کو زیر کر سکتے ہیں اور پھر کوئی طاقت ہم پر حملہ نہیں کر سکتی۔ اس واقعہٴ فیل سے یہ بات اُن کے دل میں پیدا کرانی مطلوب تھی۔

یمن کی فوج سے قریش نہ لڑے اس کے دو سبب تھے۔ ایک تو ان کو خیال تھا کہ اگر لڑائی شروع ہوگئی تو شام کے نصرانی بھی اُن کے مددگار ہو جائیں گے اور اگر بالفرض ہم کامیاب ہو بھی گئے تو بھی ہماری تجارت کے دونوں راستے بند ہو جائیں گے۔ تجارت پیشہ لوگوں کو اس کا بڑا خوف تھا۔ دوم یہ کہ بیت‌اللہ کی عمارت بہت پرانی ہو گئی تھی اور سقف میں شگاف ہو گئے تھے۔ اُنہوں نے اپنے خیال میں یہ بات گوارا کر لی کہ ہم ضعیف تجارت پیشہ لوگ ہیں، بادشاہوں سے نہیں لڑ سکتے۔ اگر یمن کی فوج نے ظلماً بیت‌اللہ کو گرا دیا تو پھر ہم اس کو از سرِ نو احسن طریقے پر بنا لیں گے۔ یہ اُن کی آخری بُزدلی تھی۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے زمین تیار کرنا بھی اِسی واقعہ سے ہوا۔ اس واقعہ کے بعد کفار میں بھی ملک گیری کے خیال آنے لگے اور اُنہوں نے معلوم کر لیا کہ خدا تو ہمارے ساتھ ہے تو بادشاہوں کا کیا ڈر۔ یہ وہ تدبیر الٰہی تھی جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے آسانی مہیا ہو سکے اور و نیسرك لليسرىٰ کا پورا پورا مضمون ظاہر ہو جائے۔

اسی زمین پر یعنی حجاز میں جو قرآن مجید کا مرکز ہے بیت‌اللہ ہے۔ اور اس

قرآن پر عمل کرنے والی پہلی جماعت جو نمونہ کا کام دے گی وہ قریش ہے۔ انہی کے طریقہ پر اُن کے ساتھ انصار (دوسری قوموں کے لوگ) مل گئے اور اس طرح اسلام کی ایک مرکزی جماعت پیدا ہو گئی۔ اس پر پہلی سورتوں میں کافی بحث ہو چکی ہے۔ قریش میں ایک خاص قسم کا نیشنلزم تھا۔ جب تک اُس کی اصلاح نہ کر دی جائے وہ برے نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ اِس سورت میں گویا نیشنلزم تحریکوں کی اصلاح کی طرف اشارہ ہے کہ اسے کس طرح درست کیا جائے۔ اس سورت کا لفظی و معنوی تعلق ظاہر ہے کہ بعض مفسرین نے لام جارّہ کو ماکول سے متعلق کیا ہے۔

آیت (۱ و ۲) لایلاف قریش۝ ایلافھم رحلۃالشتاء والصیف :- قریش کا طبعی شوق تھا کہ وہ گرمی اور سردی میں تجارت کے لیے سفر کرتے تھے۔ گرمی میں شام کی طرف اور سردی میں یمن کی طرف۔ ہندوستان کی جو تجارت یورپ کے ساتھ تھی، اہل یمن اس کا واسطہ تھے۔ عربوں کی تاریخ میں یمنی قوموں کی ترقی کا کافی ذکر ہے اور اس کی بنیاد یہی تجارت تھی۔ اِسی طرح مدینہ سے شمال میں وادی القریٰ کا عرب کی تاریخ میں ذکر آتا ہے۔

حضرت شعیب؈ مدینہ کے شمالی علاقہ میں رہتے تھے۔ آپ کی قوم نے تجارت میں بڑی ترقی کی تھی۔ آپ کی قوم کے بعد یہود کا ایک گروہ جو کہ ضرورت سے حجاز میں آ کر آباد ہو گیا تھا اُس نے تجارت اپنے ہاتھ لے لی تھی۔ اُن کی بستیاں مدینہ سے لے کر شام تک چلی گئی تھیں۔ اُن کی ترقی بھی قریش کے روبرو تھی۔ قریش اپنے آپ کو طبعی طور پر حجاز کے مالک اور مرکزی قوم سمجھتے تھے۔ اِن تاریخی اور اپنے زمانے کے اثرات سے ان میں تجارت کا خاص شوق تھا اور اس کے ذریعہ اُنھوں نے ترقی کی بہت سی توقعات قائم کرلی تھیں۔ لیکن اس بلند خیالی کے مطابق ان کو تجارتی سامان میسر نہیں تھا تو اُن کی مشکلات حل کرنے کے لیے ایک بڑا ذریعہ یہ بن گیا کہ وہ بیت اللہ کے خادم تھے۔ اور تمام عرب میں بیت اللہ کی عزت تھی جو عام طور پر مسلم تھی۔

اس واقعۂ فیل کے بعد یمن اور شام میں بھی بیت اللہ کی عزت کا سکّہ دلوں پر بیٹھ گیا۔ اب لوگ قریش کو مذہبی حیثیت سے بزرگ سمجھ کر بہت سی رعایت دیتے۔ اُن کے قافلے امن سے سامان لاتے اور دور دراز ملکوں میں لے جانے میں کامیاب ہو جاتے اور اس تجارتی ذریعہ سے جس کی کامیابی میں بیت اللہ کی خدمت کا بڑا دخل تھا مکہ کے تمام رہنے والوں کو روٹی پنہچتی تھی۔

یہ سورت اہلِ قریش یعنی مکہ کے رہنے والوں پر بھاری ذمہ داری ڈالتی ہے اور اُن کو متنبہ کرتی ہے کہ تم اپنی قومیت کی بنیاد نسلی تنافر پر نہ رکھو۔ بلکہ اس

بیت کے رب کی عبادت کرنے کو اپنا شعار بناؤ۔ اس مختصر جملہ میں یہ مطلب آ جاتا ہے کہ ابراھیم و اسماعیل علیہما السلام کی جو توقعات ھیں کہ اُن کی نسل میں سے ایک جماعت تمام دنیا کے لیے نیک کاموں میں پیشوا ثابت ھو وہ جماعت اس نصب العین کو اپنے سامنے رکھے۔ نیشنلزم کے سامنے جب بلند نظریہ آ جائے تو اُس کی اصلاح ھو جائے اور اگر ایک اُصول کی حمایت پر ایک قوم تُل جائے تو اس اصول کے آدمی جس قوم میں ملیں وہ ضرور اُن کی عزت کریں گے۔ اس طرح ان کی نیشنلزم طاقت انٹرنیشنل ازم کے لیے مرکز کا کام دینے لگے گی اور یہ نیشنلزم کی انتہائی اصلاح ھے۔

آیت (۳) **فلیعبدوا رب ھذا البیت الذی اطعمھم من جوع و آمنھم من خوف** :- اس بیت کے رب کے غلام بن کر رھیں جس رب نے ان کی روٹی کا سامان اس بیت اللہ کے وسیلہ سے بنا دیا ھے۔ اور جابر بادشاھوں کے خوف سے امن میں بسنے لگے ھیں تو ان پر واجب ھے کہ اس پیشین گوئی کے مصداق بن جائیں جو حضرت ابراھیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام نے کی تھی کہ اس گھر سے ایک جماعت صالحہ ان کی اولاد میں سے پیدا ھو جو تمام قوموں کی استاد بن جائے اور تمام قوموں کو اس مرکز پر جمع کر دے۔ اس لیے تم کو چاھیے کہ نیشنلزم کا خیال چھوڑ کر اس نصب العین کو سامنے رکھو۔ جس قوم میں یہ نکتہ موجود ھو اُس کو اپنے اندر جذب کرلو اور اپنے اندر یہ خصوصیات پیدا کرلو۔

یہ حکم اس لیے دیا گیا ھے کہ قریش تجارت کا شوق رکھتے تھے اور ان کو جو تجارتی سہولتیں میسر تھیں وہ فقط اس بیت اللہ کے خادم ھونے کی حیثیت سے ملتی تھیں۔ اِسی بیت اللہ کے ذریعے اُن کو امن ملا ھوا تھا تو اس بیت اللہ کی تعمیر کے وقت (یعنی حضرت ابراھیم اور اسماعیل علیہما السلام کے) جو اصول مانے گئے تھے قریش کو ان کا حاصل کرنا ضروری ھے یعنی اس بیت کی تعمیر کے وقت جن اصولوں کو اساسی طور پر مانا گیا تھا اُن کے یہ حامل نہیں لیکن اگر وہ ان اصولوں کی حمایت کریں گے تو حفاظت سے رھیں گے اور اُن کو رزق میسر ھوتا رھے گا اور کامیاب ھوں گے۔

واقعہ فیل کے بعد نوجوان قریشیوں میں ملک گیری کی ھمت پیدا ھوگئی تھی۔ عمرو بن العاص کہتے ھیں کہ جب میں مصر کی طرف تجارتی سامان لے جاتا تھا تو یہی سوچتا تھا کہ مصر پر کدھر سے حملہ کیا جائے۔ اور مغیرہ بن شعبہ کا قول ھے کہ قبل اسلام جب میں ایران گیا تو بادشاہ کو سجدہ کرتا دیکھ کر دل میں آیا کہ بادشاہ کو تھپڑ مار کر اتار دوں، ایسے مخنّث لوگ بادشاھی کر رھے ھیں حالانکہ بادشاھی کے زیادہ حقدار ھم ھیں۔

107

## سُوْرَةُ الماعُون مَكِيَّةٌ وَهِيَ سَبْعُ آيَاتٍ

سورہ ماعون مکہ میں نازل ہوئی اور اِس کی سات آیتیں ھیں

### بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ھے

أَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ (١) فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ (٢) وَلَا

تونے دیکھا اُسکو جو جھٹلاتا ھے انصاف ھونے کو سو یہ وھی ھے جو دھکے دیتا ھے یتیم کو اور نہیں

يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (٣) فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ (٤) الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ

تاکید کرتا محتاج کے کھانے پر پھر خرابی ھے اُن نمازیوں کی جو اپنی نماز سے

١ ع ٣٢ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (٥) الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ (٦) وَ يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (٧)

بے خبر ھیں وہ جو دکھلاوا کرتے ھیں اور مانگی (مانگنے سے) نہ دیویں برتنے کی چیز.

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

# سورۃ الماعون مکیۃ

سورۃ ماعون کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا اور اُس کا غلام ہو رہنے کا یہ مطلب نہیں کہ مذہبی آدمی یتیموں ، بے کسوں اور مسکینوں کی امداد نہ کرے اور تجارت وغیرہ سے سرمایہ جمع کرنے کا یہ مطلب ہے کہ جماعت کے غریب اور مفلوک‌الحال لوگوں کے کھانے پینے کا بندوبست کرنا چاہیے۔ اگر اس میں مذہبی جماعت فیل ہوگئی تو پھر نماز میں بھی فیل ہے۔

سورۃ قریش میں قریش کی قومیت کو ایک مذہبی جماعت میں تبدیل کرنے کی تعلیم دی گئی تھی۔ مذہبی جماعتوں میں جو عیب پیدا ہو جاتے ہیں آن کو اس سورت میں سمجھایا گیا ہے مذہب کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قوم کی خرابی دور کرنے کے لیے مذہبی رنگ اختیارکیا جائے مگر قوم میں وہ خرابیاں بدستور قائم رهیں یا آگے سے بھی بڑھ جائیں.

آیت (۱ تا ۳) ارئیت الذی یکذب بالدین فذالک الذی یدع الیتیم و لا یحض علی طعام المسکین :- ایسے آدمی کا خاکہ کھینچا گیا ہے جو دوسری زندگی کا منکر ہے۔ ایک مذہبی آدمی اور دنیا دار میں نمایاں فرق یہ ہوتا ہے کہ خدا کے ماننے میں تو دونوں قریب قریب شریک ہیں مگر آخرت کو ماننے والا اِنسان دین دار کہلاتا ہے اور اس سے بے پروائی برتنے والا اِنسان دنیا دار کہلاتا ہے۔ اِس سورت میں ایک دنیا دار سرمایہ دار اور دین دار کا مقابلہ کر کے دکھایا گیا ہے کہ کون نامعقول ہے۔

ارئیت الذی یکذب بالدین :- وہ آدمی جو یوم‌الدین کا انکار کرتا ہے۔ کیا تو نے آسے دیکھا؟

فذالك الذی یدع الیتیم :- اس آدمی کی یہ حالت ہے کہ وہ یتیموں کو دھکے دیتا ہے۔ یتیم کی لازمی وصف ہے بے کس و بے یارومددگار۔ وہ ایسے لوگوں کو اپنی طرف آنے نہیں دیتا۔

و لا یحض علی طعام المسکین :- اور مساکین کو کھانے کی طرف نہیں بلاتا۔ ان کے طعام کا بندوبست نہیں کرتا اور ان کے گذران کی کوشش نہیں کرتا۔ یہی

لوگ یکذب بالدین ہیں۔ اگرچہ وہ اپنے آپ کو دین دار سمجھتے ہوں۔

یتیموں کو دھتے دینے اور مساکین کے کھانے سے بے پروائی برتنے کی وجہ یہ ہے کہ ایسے شخص کو اس میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا اور آخرت کا وہ قائل نہیں تو جس قدر اصول اُس کی عقل نے تسلیم کیے ہیں اُن پر یہ پورا ہے۔ اِس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک نیشنلسٹ جتنی چیزوں کو صحیح سمجھتا ہے وہ اگر ان کا پابند ہو تو وہ قابل تعریف مانا جا سکتا ہے۔ اب اس کے مقابلے میں دین دار آدمی کا ذکر آتا ہے کہ ان نمازیوں کے لیے افسوس ہے۔

(آیت ۵ و ۶ آیت ۷ کے بعد دیکھو)

دوسری تقریر یہ ہے کہ مذہبی جماعت جب سرمایہ پرست ہو جاتی ہے اور جب وہ نظام عالم میں فیل ہو جاتی ہے تو اپنے آپ کو مذہبی ثابت کرنے کے لیے صلوٰۃ کی پابند ہو جاتی ہے لیکن چونکہ اُس نے کوئی مشقت نہیں جھیلی اس لیے باوجودیکہ وہ جماعت نماز باقاعدہ پڑھتی ہے مگر مفاجات جو روح نماز ہے اس میں نہیں ہوتی۔

آیت (۷) و یمنعون الماعون :- جن چیزوں کو لوگ عاریۃً لے کر فائدہ اٹھا سکتے ہیں یہ نمازی لوگ اُن سے بھی لوگوں کو فائدہ حاصل کرنے نہیں دیتے۔ مثلاً کہ ایک آدمی کے پاس پتیلی ہے وہ اپنا کھانا پکا چکا ہے، اب ہمسایہ کو ضرورت ہے کہ اس میں اپنا کھانا پکا کر اُسے واپس کر دے گا۔ ماعون اُس چیز کو کہتے ہیں جو ایک شخص کے استعمال کے بعد دوسرے کے استعمال میں بھی (ضایع ہونے کے خطرے کے بغیر) آ سکتی ہو۔

اگر کوئی شخص نماز تو پڑھتا ہے لیکن اُس کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنی چیز عاریۃً دوسرے شخص کو نہیں دیتا تو اُس پر افسوس ہے۔ ایسی دین داری سے کیا فائدہ کہ لوگوں کی عام خوبیاں بھی اُن نمازیوں میں نہیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ نیشنلزم کی اصلاح کے لیے جو دین داری پیش کی جا رہی ہے وہ ایسی ہے۔

آیت (۵) فویل للمصلین* الذین ھم عن صلاتھم ساھون :- اب یہ شبہہ ہوتا ہے کہ واقعی دین دار ایسے ہی ہوتے ہیں۔ نماز پڑھنے والے اور خدا کو ماننے والے

---

* اصول فقہ کے مسئلہ صفت سے زید کی مثال دی جاتی ہے کہ جب وہ اُس صفت میں کمال رکھتا ہے تو وہ اس صفت میں مشہور ہوتا ہے۔ جیسے صرف میں پڑھایا جاتا ہے کہ :- ضرب یضرب ضرباً فھو ضارب۔ یعنی زمانہ گذشتہ میں زید نے مارا۔ حال کے زمانہ میں مارتا ہے اور مستقبل میں مارے گا اور مارتا بھی خوب ہے تو ایسی حالت میں اُس کو ضارب کہا جائے گا۔ اب یہاں مصلین تب بولا جائے گا جب پوری شرائط و ارکان سے نماز ادا کرے۔ اگر اِس زمانہ میں ویل للمصلین کے معنی ویل للمسلمین کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

کیا ایسی ہی بد عنوانیاں کرتے ہیں - اس کا جواب دیا گیا ہے کہ یہ لوگ سچے
دین دار نہیں ہیں یہ فقط دکھلاوے کی نماز پڑھتے ہیں - نماز کے معنی بالکل سمجھے
ہوئے ہیں تو حاصل یہ نکلا کہ یہ جماعت دین دار نہیں ہے .

آیت (۶) اِلذی هم یُراؤن :- یہ نمائشی طور پر نماز پڑھتے ہیں - قرآن مجید
ایسی دین داری کی دعوت نہیں دیتا - ایسے دین دار سے وہ آدمی جو لادین ہے زیادہ
اچھا ہے کیوں کہ وہ اپنے اصول کا پابند ہے .

یہ دین دار لوگ جو ایسی ذلیل حرکتیں کرتے ہیں قرآن مجید کی دین دار جماعت
سے نہیں ہیں - یہ تو اپنی نماز سے بھی غافل ہیں - اور یہ سردار طاقت ہے - اس سے
کوئی اُمید نہیں کہ یہ کامیاب ہو - یہ جماعت اور مذہبی کام بھی رسمی طور پر
کرتے ہیں - ان کے دل میں تقرب الٰہی کا ذرہ بھر بھی خیال نہیں ہے .

حاصل کلام یہ کہ یہاں مذہبی جماعت کے ناکام ہونے کا خاکہ کھینچا گیا
ہے کہ جو جماعت یتیموں اور مسکینوں کو سنبھالنے کا اپنے اوپر ذمہ نہیں لیتی وہ
جماعت در اصل بے دین ہے - وہ مذہبی لباس پہن کر اندرونی طور پر سرمایہ پرست
ہیں , وہ خدا پرست نہیں - اگر اُن کو ایمان بیوم الدین ہوتا تو وہ اعلیٰ کام میں (جس
میں رضائے مولا یقیناً موجود ہے) سبقت کرتے اور یتیموں اور مسکینوں کو کھانا کھلاتے
اور اُن کو اپنے عیال کی طرح سمجھتے - یہی تو دین ہے اور اسی کے سبب سے یوم الدین
میں بہت اجر کی توقع ہے - اور یہ مدعی دین جو یتیموں کو ڈھکیلتے ہیں اور
مساکین کے کھانے کا کوئی انتظام نہیں کرتے یہ در اصل منکر بیوم الدین ہیں - کیوں
کہ یوم الدین میں تو انسانیت کا ظہور ہو گا اور یہ انسانیت سے دور ہیں - (دیکھو
سورۃ البلد) .

اب جب یہ دین دار طبقہ ان انسانیت کے کاموں (یعنی یتیموں کو اپنے عیال کے
مثل رکھنے اور مسکینوں کے کھانے کے انتظام کرنے) میں فیل ہو جاتے ہیں تو یہ
نماز کی طرف دوڑتے ہیں مگر وہاں بھی فیل ہو جاتے ہیں - انسان خدائے تعالیٰ کی
طرف طبعاً اُس وقت دوڑتا ہے جب اُس کے اوپر بڑی مشکل آ پڑتی ہے یا اُس نے ایک
بڑا کام شروع کیا ہوا ہوتا ہے جیسے یتیموں اور مسکینوں کے پرورش کا انتظام - جس
نے کوئی انسانیت کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لی تو گویا اُن کا دماغ بڑا عیش سے
واقع ہوا ہے - وہ اگر نماز پڑھتے ہیں تو فقط دکھانے کے لیے تاکہ لوگ اُن کی طرف
متوجہ ہوں اور ان کو دین دار نمازی سمجھیں - مگر اُن کے دل میں اللہ تعالیٰ سے
کوئی تعلق نہیں - وہ اپنی التجا اور تضرع رب سے نہیں کرتے کیوں کہ اُن کے سر پر
بار نہیں - اور پھر یہاں تک نالائق ہے کہ ماعون جیسی اشیا سے متعلق کہتا ہے

ہے کہ لوگوں کو مت دو۔ اس کو تو چاہیے تھا کہ لوگوں کو تلقین کرتا کہ یتیموں اور مساکین کا انتظام کریں تاکہ لوگوں کے دل میں انسانیت پیدا ہو اور خود بھی اُس پر عمل کرتا مگر وہ یتیموں کو دھکّے دیتا ہے اور مساکین کا کوئی انتظام نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے گھر میں کوئی چیز فارغ پڑی ہے تو فقط فائدہ اُٹھانے کے لیے عاریۃً بھی لوگوں کو نہیں دیتا اور اگر کوئی ایسی اشیاء دے دیتا ہے تو اُس پر بندش ڈالتا ہے اور طرح طرح سے لوگوں کو سمجھاتا ہے کہ اپنی اشیاء لوگوں کو استعمال کے لیے نہ دیں۔ خود بھی بخیل ہے اور لوگوں کو بھی بخل سکھاتا ہے۔ ہمارے ہندوستان کے گدّی نشین پیر اس سورت کے پورے پورے مصداق ہیں۔ اور حضرات علماء میں سے بھی کوئی نظیر نہیں ملتی کہ ان میں سے کوئی بھی مساکین سے ظلم دور کرنے اور مساکین کے کھانے کا انتظام کرنے والا ہو. مذہب عمل سے ترقی کرتا ہے نہ کہ محض علم سے۔ مدرسہ اور خانقاہیں بھری پڑی ہیں۔ اُن میں نہایت بد اخلاقی پھیلی ہوئی ہے۔ کیوں کہ اُن سے جو کام مطلوب ہے وہ نہیں لیتے۔ جیسے ہی تعلیم سے فارغ ہوئے اُن کو مدرسہ سے نکال دیا۔ آگے وہ کیا کرے اُس کی خبر نہیں۔ انسانیت کے کام اگر اُن کو مدرسوں اور خانقاہوں میں سکھائے جاتے تو آج مسلمانوں کی حالت یوں تباہ نہ ہوتی کہ سود در سود میں غرق ہیں۔ علاوہ اس کے اخلاق بھی تباہ ہیں.

108

# سُوْرَةُ الْكَوْثَرِ مَكِّيَّة وَهِيَ ثَلٰثُ آيَاتٍ

سورہ کوثر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی تین آیتیں ہیں

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ (۱) فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ (۲) اِنَّ شَانِئَكَ

بے شک ہم نے دی تجھکو کوثر سو نماز پڑھ اپنے رب کے آگے اور قربانی کر بے شک جو دشمن ہے تیرا

هُوَ الْاَبْتَرُ (۳)

وہی رہ گیا پیچھا کٹا.

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم○

# سورۃ الکوثر مکیۃ

اس سورت میں ان دینی اصولوں کا خلاصہ ہے جن کی دعوت نیشنلسٹوں کو دی جاتی ہے۔

آیت (۱) إنا أعطيناك الكوثر:- اے رسول! (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تجھے خیر کثیر دیا۔ خیر کثیر کو قرآن مجید میں حکمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کا ترجمہ ہے حکمت۔ اور دوسرے موقع پر حکمت کا کورس قرآن عظیم بتلایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے تجھے قرآن مجید دیا۔

مشہور یہ ہے کہ الکوثر ایک حوض یا نہر کا نام ہے جو قیامت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو پانی پینے کے لیے ملے گی۔

شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ العزیز حجۃ اللہ البالغہ میں کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دنیا میں قرآن مجید کا فیض پھیلا، قوموں نے طبقہ در طبقہ قرآن مجید سیکھا اور اُنہوں نے اُس سے فائدہ اُٹھایا۔ یہی فیض حاصل کرنا حوض کی شکل میں تبدیل ہو جائے گا۔ جس آدمی نے یہاں جس قدر قرآن مجید سیکھا ہے اُسی انداز سے وہاں تشنگی دور کرنے والا پانی ملے گا۔ تو جن روایتوں میں حوض وغیرہ سے تعبیر کیا گیا ہے وہ بھی قرآن مجید کا اثر ٹھہرا۔

دنیا میں حوض کوثر یہی قرآن مجید ہے۔ حوض کوثر کی صفتیں جو حدیث میں منقول ہیں وہ قرآن مجید پر صادق آتی ہیں۔ اور قیامت میں قرآن مجید کی مثالی اور روحانی شکل وہی حوض کوثر کا پانی نظر آئے گا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے اعلیٰ خاندان کے سردار ہیں۔ آپ کے پاس ایک علم (قرآن مجید) ہے۔ قریش کو چاہیے کہ اپنا علمی کمال اپنے سردار کی اس کتاب کو بنالیں۔ اس سے نیشنلزم کی اصلاح ہو جائے گی۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا بڑا ذخیرہ خیر کثیر کا دیا گیا تو آپ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ:-

آیت (۲) فصل لربك:- اپنے رب کو یاد کر۔ اور اس صلواۃ کے ذریعہ قرآن کی

اشاعت کا حکم ہوتا ہے یعنی اشاعت قرآن کے وقت آپ کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہو۔ اس کا یہ فائدہ ہو گا کہ جب آپ کے پاس بڑی بڑی جماعتیں آ جائیں گی اور آپ کے کام میں شریک ہو جائیں گی تو آپ کے دل میں غرور اور تکبر پیدا نہ ہو گا اور آپ اللہ کے بندے اور غلام رہیں گے اور اس تعلیم کا مالک اللہ کو سمجھیں گے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ وہ قرآن مجید قوموں میں پھیلائیں۔ قرآن مجید تو اللہ تعالیٰ نے عنایت فرمایا ہے۔ اب فرض یہ ہے کہ اس کو پھیلایا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز پڑھتے ہیں تو اس میں بھی قرآن مجید پڑھا جاتا ہے اور یہی طریقہ اشاعت کا ہے۔

آیت (۳) **وانحر**:- اس طرح قریش میں ماننے والی جو جماعت تیار ہو رہی ہے اُن کے لیے کھانے کا انتظام مہیا کرو۔ اونٹ ذبح کرنے میں ایک سخاوت کی لہر ہے۔ اگر ایک آدمی کے کھانے کا انتظام کرنا ہو تو بھی ایک اونٹ ذبح کرنا ہو گا۔ اس طرح بہت سے لوگ خود بخود کھانا کھا سکیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو دریا دلی سے اپنے حال میں شریک کرو۔ اور اسی طرح علمی و عملی اصلاح ہو جائے گی۔

اِس سورت میں نماز کے ساتھ قربانی کو بھی جمع کردیا گیا ہے۔ سورت ماعون میں کہا گیا تھا کہ وہ نماز پڑھتے ہیں مگر مساکین کے کھانے کا انتظام نہیں کرتے۔ اب اِس جگہ بتلایا کہ اُن کی یہ حالت ہے کہ ایک آدمی کے لیے سارا اونٹ ذبح کرتے ہیں۔

آیت (۳) **ان شانئك هو الابتر**:- جو آدمی تیری برائی چاہتا ہے وہ ناکام رہے گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ قریش جب تک اِس دین کو قائم رکھیں گے اُس وقت تک ان پر کوئی غالب نہیں آ سکے گا۔ دوسری حدیث میں حکم دیا گیا ہے کہ اگر کوئی حبشی ہو اور وہ کتاب اللہ کو قائم رکھتا ہو تو اس کی اطاعت کرو۔ ان دونوں آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی جس قدر عزت کی اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس دین کے پابند تھے۔ اس میں شک نہیں کہ قریش ذاتی طور پر آپ کی قوم میں سے تھے مگر اس قومیت کو قرآن مجید سے کیا تعلق؟

غرض اِس سورت میں بتلایا گیا ہے کہ جو اس تعلیم (قرآن مجید) اور دین سے بغض رکھتے ہیں وہ ناکام رہیں گے۔ ابتر کہتے ہیں اُس شخص کو جس کا بیٹا نہ ہو۔ تو یہ ایک عام ذہنیت ہے کہ انسان یہی سمجھتا ہے کہ اگر اس کا بیٹا ہے تو اُس کا کام آگے چلتا رہے گا، ورنہ بند ہو جائے گا۔ اس واسطے ان کو بتایا گیا ہے کہ جو آدمی خدا ترس نہ ہو اور مستحقین کی مدد نہ کرے وہ ناکام رہے گا۔ اور اُس

کی تحریک بھی اسی پر ختم ہو جائے گی۔ اس کے برعکس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک کی طرف اشارہ ہے کہ وہ تحریک کامیاب رہے گی اور آپ کا کام چلتا رہے گا۔

ہمارے مفسرین کی بڑی غلطی یہ ہے کہ جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو خطاب ہوتا ہے تو اس کام کو آپ کی ذات تک محدود سمجھتے ہیں یعنی اس کو خاص بنا لیتے ہیں۔ اس میں غلطی یہ ہے کہ جو حکم آپ کو اس جماعت کے افسر کے اعتبار سے دیا گیا ہے تو اب جب کہ افسر کو حکم دیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس حکم کے ساتھ تمام جماعت بھی شامل ہے۔

اب جو کہا گیا ہے کہ اس تحریک کے خلاف کام کرنے والے ناکام رہیں گے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک کو جو آپ کے ساتھ چلانے والے ہیں اُن کے ذریعے آپ کے کام کا سلسلہ چلتا رہے گا۔

حاصلِ یہ نکلا کہ اس خیر کثیر (قرآن مجید) کی اشاعت کے لیے ایک تو اس کے احکام پر سر بسجود ہو جاؤ۔ اور اس کے سوا اپنا کوئی پروگرام اختیار نہ کرو، اللہ تعالیٰ کے آگے سر بسجود رہو، اتّصال اپنا قائم رکھو، اسی حالت میں اشاعت تعلیم قرآن مجید کیا کرو اور اس قانون کی اقامت کے لیے قربانیاں گوارا کرو خواہ گلا کاٹا جائے۔ تو جب اِس مضبوطی سے اور ہمت و استقلال سے کام کیا جائے گا تو تم ہی کامیاب رہو گے اور انقلاب اس کے سوا ہو نہیں سکتا جب تک انسان اپنے قانون پر مستعدی سے کام نہ کرے اور قربانی دینے پر تیار نہ ہو۔ جب وہ قربانی دے گا اس وقت دشمن مغلوب ہو جائے گا اور اُس کا پیچھا چھوٹ جائے گا اور اُس کو کہیں سے مدد نہیں پہنچے گی۔ اور لشکر تازہ دم اُسی وقت رہتا ہے جب تازہ دم فوج آ جائے۔ اور جب ایک فوج محصور ہو گئی تو مفتوح ہو گئی۔ اِسی کے لیے کہتے ہیں اِذْ حُوصِرَ سُقِطَ۔

اب اگلی سورتوں میں بیان ہے کہ اسلام کیسے غالب ہوا۔

109

# سُوْرَةُ الْكَافِرُونَ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ سِتُّ آيَاتٍ

سورہ الکافرون مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چھہ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ (۱) لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ (۲) وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ (۳)

تو کہہ اے منکرو میں نہیں پوجتا جس کو تم پوجتے ہو اور نہ تم پوجو جس کو میں پوجوں

وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ (۴) وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ (۵) لَكُمْ

اور نہ مجھکو پوجنا ہے اُس کا جس کو تم نے پوجا اور نہ تم کو پوجنا ہے اُس کا جس کو میں پوجوں تم کو

دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ (۶)

تمہاری راہ اور مجھکو میری راہ.

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

# سورۃ الکافرون مکیۃ

آیت (۱) **قل یا ایھا الکافرون :-** اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کافروں کو کہو (یعنی ری اکشنری والوں کو) کہ اب ہمارا تمہارا تعلق منقطع ہو گیا۔ کافر سے وہ لوگ مراد ہیں جو اسلام کے خلاف اپنے پروگرام کو کامیاب بنانا چاہتے ہیں۔ اس واسطے اُن کو پہلی آیت میں خطاب کیا گیا ہے۔ دوسری اور تیسری آیت میں کہا گیا ہے کہ :-

آیت (۲ و ۳) **لا اعبد ما تعبدون و لا انتم عابدون ما اعبد :-** ہم تمہارے معبود کی اور تم ہمارے معبود کی عبادت نہیں کرتے۔ تمہارا اور ہمارا پروگرام آپس میں نہیں ملتا۔ اور اس کے ساتھ ہی ہمارا تمہارے ساتھ مرکزی نقطہ نہیں ملتا.

دو دینی تحریکوں میں کم از کم اتنا اثر تو ضرور ہونا چاہیے کہ اُن کا معبود ایک ہو مگر یہاں حالت یہ ہے کہ ہمارا اور اُن کا معبود ایک نہیں۔ غرض اِن دو آیات میں بتلایا گیا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے معبود کو نہیں مانتے (زمانۂ حال میں).

آیت (۴ و ۵) **و لا انا عابد ما عبدتم و لا انتم عابد ما عبدتم :-** اِن دو آیات میں بتلایا گیا ہے کہ ہم آئندہ بھی ایک دوسرے کے معبود کو نہیں مانیں گے.

آیت (۶) **لکم دینکم ولی دین :-** تمہارے لیے تمہارا پروگرام اور ہمارے لیے ہمارا پروگرام۔ غرض دونوں کے پروگرام اب ایک دوسرے سے پوری طرح منقطع ہو گئے۔ حقیقت میں یہ ایک طرح کا الٹیمیٹم ہے۔ جب تک دو جماعتوں اور دو سلطنتوں میں ملنے کی توقع ہوتی ہے اُس وقت تک ان دونوں میں لڑائی نہیں ٹھن سکتی۔ مگر جب ملنے کی توقع ختم ہو جاتی ہے اُس وقت لڑائی کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہتا۔ اب یہ کہ لڑائی کب ہو گی، اس کے متعلق حالات خود فیصلہ کریں گے۔ سفارتی تعلقات کا منقطع کرلینا ہی لڑائی کا پیش خیمہ ہے بہت سے مفسروں نے بے سمجھی سے اس سورت کو لڑائی کے ترک کردینے پر محمول کرلیا ہے یعنی یہ کہ اس سورت میں لڑائی کو موقوف کرنے کے لیے حکم دیا گیا ہے۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ درحقیقت یہ ایک قسم کا الٹیمیٹم تھا۔ مولوی حمیدالدین صاحب مرحوم کی تفسیر بھی اسی طرح ہے.

فراہی

سر سید نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام میں لڑائی مدافعانہ ہے
مولوی حمیدالدین صاحب اس سورت کو الٹیمیٹم قرار دیتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ
سورت مکّی ہے تو مکہ مکرمہ میں اعلان جنگ ہو چکا تھا جس سے قریش گھبرا
تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق دارالندوہ میں مشورہ کے لیے جمع
تھے ۔ وہ اسے ایک بڑی عظیم جنگ سمجھتے تھے کیوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کے بلند ارادوں اور کام کی اعلیٰ تدبیرات کو دیکھ کر آن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کی کامیابی کا پورا یقین ہو چکا تھا .

## سُورَةُ النَّصْرِ مَدَنِيَّةٌ وَهِيَ ثَلٰثُ آيَاتٍ 110

سورہ نصر مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی تین آیتیں ہیں

### بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ (۱) وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ

جب پہنچ چکے مدد اللہ کی اور فیصلہ اور تو دیکھے لوگوں کو داخل ہوتے

اَفْوَاجًا (۲) فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا (۳)

غول کے غول تو پاکی بول اپنے رب کی خوبیاں اور گناہ بخشوا اس سے بے شک وہ معاف کرنے والا ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم o

# سورة النصر مدنیة

الٹیمیٹم کے بعد لڑائی ہوتی ہے۔ الٹیمیٹم کا جو نتیجہ نکلا وہ اس سورت میں بتلایا گیا ہے کہ مکہ بھی فتح ہو گیا جو مرکزِ عرب تھا۔ اب ایک حکومت قائم ہو گئی ان اصولوں پر جن کا آپ نے مکہ مکرمہ میں اعلان کیا تھا اور ظاہر میں یہ حکومت نیشنلسٹ یعنی قومی تھی مگر اصولاً وہ انٹرنیشنل طاقت تھی جس میں دوسری قومیں شریک ہو گئیں.

آیت (۱) إذا جاء نصر الله و الفتح :- اللہ تعالیٰ کی مدد ہے، مرکزی جماعت کا قیام ۔ مہاجرین اور انصار کی مرکزی جماعت اپنا فرض پہچان گئی۔ جو کام پہلے صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک سے تعلق رکھتا تھا آپ کی تعلیم سے جو جماعت پیدا ہوئی اُس نے اِس فرض کو اپنے اوپر ذمہ داری سے لے لیا یعنی اُسے اپنا فرض قرار دیا تاکہ حجاز جیسے ملک میں ایسی اعلیٰ تحریک کے لیے مضبوط مرکزی کمیٹی قائم ہو جائے اور وہ بھی دس بیس برس کی قلیل مدت میں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت تھی۔ اسی کو نصراللہ سے تعبیر کیا گیا اور یہ مسلسل رہے گی (یعنی یہ نصر من اللہ آپ کی اور آپ کی جماعت کے ساتھ مسلسل رہے گی) اس کا پہلا نتیجہ یہ ہے کہ اس مدد ملنے کے بعد مکہ مکرمہ فتح ہو گیا جو حجاز کا دارالسلطنت تھا.

آیت (۲) ورأیت الناس یدخلون فی دین الله افواجاً :- مرکز پر قبضہ ہونے کے بعد تمام ملک میں قبضہ مکمل ہو رہا ہے اور قوموں کی قومیں اِس مسلک اور دین میں داخل ہو رہی ہیں اور آپ کے پروگرام کو قبول کر کے اور آپ کی تحریک میں شامل ہو کر خدائی انٹرنیشنلزم کو کامیاب بنانے کی کوشش میں لگ گئی ہیں.

آیت (۳) فسبح بحمد ربك واستغفره :- اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تو نے اپنا کام پورا کر دیا، اب تو اللہ کو یاد کر۔

اس سورت میں ذکی صحابہ کا امتحان ہو رہا ہے۔ سب سے پہلے سیدنا ابوبکرصدیق رضہ اِس سورت کا مطلب یہ سمجھے کہ آنحضرت (روحی فداہ) صلی اللہ علیہ وسلم کا اب وقت ختم ہو چکا ہے۔ آپ نے اُس کام کو مکمل کر لیا جس کے لیے مبعوث ہوئے تھے،

اب آپ کو اللہ تعالیٰ جل شانہٗ حظیرۃالقدس کی طرف بلا رہے ہیں۔ اس کے بعد
عمر رضہ نے عبداللہ بن عباس کا اِس سورت میں امتحان لیا تو اُنھوں نے بھی اِس سورت
کا یہی مطلب لیا۔

مولوی حمیدالدین صاحب مرحوم نے لکھا ہے کہ اس سے مراد فتح مکہ ہے جو
حجاز کا دارالسلطنت ہے۔ مگر ہم لوگ اِسے پولیٹیکل فتح سے تعبیر کرتے ہیں کہ
اسلام کا ایک شعبہ شروع ہو گیا اور اُس سے پولیٹیکل کام کو ترقی ہوئی۔

## سُوْرَةُ اللَّهَب مَكِّيَّةٌ وَهِيَ خَمْسُ آيَات 111

سورہ لہب مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی پانچ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ (۱) مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَ مَا كَسَبَ

ٹوٹ گئے ہاتھ ابی لہب کے اور ٹوٹ گیا وہ آپ کام نہ آیا اُس کو مال اُس کا اور نہ جو اُس نے کمایا

سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ (۳) وَّ امْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ (۴) فِيْ جِيْدِهَا

اب پڑے گا ڈیگ(لپٹیں) مارتی آگ میں اور اُس کی جورو جو سر پر لیے پھرتی ہے ایندھن اُس کی گردن میں

حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ (۵)

رسّی ہے مونجھ کی۔

بسم اللّٰه الرّحمٰن الرّحیم o

# سورة اللهب مكية

مولوی حمیدالدین کہتے ہیں کہ سورت اذا جاء نصر اللہ میں مسلمانوں کی فتح کی طرف اشارہ تھا اور اس سورت میں کفار کی شکست کی طرف اشارہ ہے۔ مولوی صاحب کا ذہن اس سورت سے اس طرف متوجہ ہوا کہ قریش مکہ کا فرعون کون تھا؟ قرآن مجید کسی خاص آدمی کا نام نہیں لیتا مگر اس سورت میں اُس نے ابو لہب کا خاص طور پر نام لیا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ و سلم کے خلاف سب سے بڑی طاقت ابو لہب تھی۔ اس واسطے اُس کا نام قرآن مجید میں لیا گیا ہے۔ اور اس شکست کا ذکر ہے۔ مگر اسلامی روایتوں میں یہ عام نظریہ ہے کہ اس اُمت کا فرعون ابو جہل تھا۔ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ مکہ کا حاکم ابوجہل تھا، ابو لہب نہیں تھا۔ مولوی حمیدالدین صاحب کو اِس جگہ عام رائے سے ہٹ کر ایک نیا فلسفہ چھانٹنا پڑا لیکن اِس بارے میں ہمیں اُن کی تفسیر سے موافقت نہیں ہے۔ اُنہوں نے ایک رسالہ کی شکل میں اِس سورت کی تفسیر کی ہے مگر ہم اور نظریہ پیش کرتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں پولیٹیکل طاقت انتہائی طاقت نہیں ہے یعنی مستقل طاقت نہیں ہے، بلکہ یہ ایک دوسری طاقت کا نتیجہ ہے۔ طاقت درحقیقت سوشل ہوتی ہے اور اس سے حکومت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ تمیز ہمیں تب سے پیدا ہوئی جب سے ہم نے یورپ کی انٹرنیشنل تحریک کا مطالعہ کیا اور اُس نے ہمیں قرآن مجید کی تفسیر میں بہت مدد دی ہے۔ ہمارے اکثر مفسرین اِس کو مدِ نظر نہیں رکھتے اِس واسطے وہ بہت پریشان ہوتے ہیں۔ یورپ میں بھی ساری طاقت اِس سے پیدا ہو رہی ہے۔ اگر کسی قوم کو دوسری قوم پر پولیٹیکل فتح ہو جائے اور سوشل فتح نہ ہو تو یہ (پولیٹیکل) فتح عارضی ہے اور چونکہ سوشل فتح نہیں ہوئی اِس واسطے سوشل کونپلیں دوبارہ نکل آئیں گی اور اُن کے خلاف سوشل طاقت جمع ہو جائے گی۔ ہم اس سورت کو سوشل فتح سے تعبیر کرتے ہیں۔ بعینہٖ اِسی طرح جس طرح سورت النصر میں پولیٹیکل فتح تھی۔

اب سوشل فاتح میں جس چیز کا ذکر آنا چاہیے وہ ایک مقابل طاقت خاندان

کی ہونی چاہیے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دل میں مخفی دعا [illegible]
جسے استعداد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چھپی ہوئی خواہش
تھی کہ اگر کسی بُرے خاندان کی سوشل مثال کا ذکر آنا منظور ہو تو وہ خاص
خاندان کے کسی گھر کی مثال ہونی چاہیے۔ ابولہب، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا
چچا تھا۔ اس واسطے آپ کا یہ خیال کہ اپنے خاندان کی بری مثال پیش کی جائے
ایک نہایت حکیمانہ فعل ہے۔ یہ آپ کی طبیعت کی مخفی دعا تھی، اللہ تعالیٰ نے
اسے قبول کر لیا اور ویسی ہی سورت نازل کی.

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے سوا اگر کسی دوسرے گھر کا ذکر
قرآن مجید میں اس طرح آ جاتا تو وہ ساری عمر کے لیے دشمن ہو جاتا اور [illegible]
صورت میں جو خرابی کا الزام ہے وہ آپ کے اپنے خاندان سے ہے اور وہ یہیں ختم ہو
جاتا ہے.

ہماری سمجھ میں ابولہب کو اگر عرب کی سوشل خرابی کا نمونہ سمجھا جائے
تو کوئی حرج نہیں۔ مگر اسے حجاز کی پولیٹیکل طاقت کا نمائندہ بنا کر فرعون سے
بالکل غلط ہے۔ مولوی حمیدالدین صاحب مرحوم کا یہ خیال کہ قرآن مجید پولیٹیکل
طاقت سے سیدھا نہیں لڑتا دراصل سرسید کے خیالات کا نتیجہ ہے کیونکہ وہ ان سے
متاثر تھے۔

اس سورت کی تفسیر یہ ہے کہ یہ فقط ایک بد دعا ہے.

آیت (۱) تبت یدا ابی لهب و تب :- خدا کرے ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹیں
اور خود برباد ہو.

آیت (۲) ما اغنی عنه ماله و ما کسب :- اپنے گھر کے اجتماع کے ذریعے جو
اس نے مال کمایا ہے اور اس نے جو آدمی پیدا کیے ہیں، خدا کرے وہ اس کے
کام نہ آئیں۔

آیت (۳) سیصلی نارا ذات لهب :- جلدی ایسا وقت آنے والا ہے کہ وہ شعلے
والی آگ میں داخل ہوگا.

آیت (۵) وامراته حمالة الحطب :- اور اس کی بیوی جو آگ جلانے کے لیے
ایندھن جمع کرتی ہے.

آیت (۵) فی جیدها حبل من مسد : اس کے گلے میں کھجور کا رسّا ہو گا.

اس طرز پر تفسیر کرنے کا مطلب یہ بن جاتا ہے کہ پولیٹیکل طاقت کے ذریعے
سوشل اصلاح نہیں ہو سکتی۔ وہ لوگوں کی ذہنیت بدلنے سے ہوتی ہے اور ذہنیت
بدلنے کا طریقہ یہ ہے کہ توجہ اور تاثیر سے دوسرے ذہن پر اثر ڈالا جائے۔ [illegible]

دوسرا طریقہ دعا ہے جسے اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی پوری توجہ سے پیش کیا جاتا ہے کہ یا اللہ تعالیٰ یہ کام ہو جائے۔ یہ سورت ایسے الفاظ میں نازل ہوئی ہے کہ یہ ہو چکا ہے۔ لوگوں نے غلطی سے اِسے پیشن گوئی پر محمول کر لیا حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ اور یہ محض دعا ہے۔ ہم کسی آدمی کے متعلق بد دعا کریں اور وہ قبول بھی ہوجائے تو اس کا یہ مطلب کبھی نہیں ہوتا کہ اس آدمی کی قوت بھی سلب ہوگئی۔ وہ اپنی پوری قوت کے مطابق زور سے کام کر سکتا ہے مگر مقابل میں اتنی طاقت آئے گی کہ وہ شکست کھا جائے گا۔ یہ شکست سوشل نوعیت کی ہو گی۔

یہاں مفسرین نے اپنی بد دماغی سے ایسے شبہات پیش کیے ہیں کہ اُن کا اِس جگہ ذکر کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ مثلاً کہتے ہیں کہ جب اُنہیں بتا دیا گیا کہ ابو لہب مسلمان نہیں ہوسکے گا اور وہ جہنم میں جائے گا تو پھر اُسے اسلام لانے کی دعوت دینے کا کیا مطلب؟ مگر جس طرح ہم نے ترجمہ کیا ہے اس پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ وہ جس وقت اپنی اصلاح کر لے گا اُسی وقت سے وہ اول درجہ کے آدمیوں میں شامل ہو سکتا ہے۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ وہ جو بری مثال پیش کر رہا ہے وہ ختم ہو یعنی بری مثال نہ رہے اور اُس کو شکست ہو۔ شکست دو قسم کی ہوتی ہے یا تو وہ جہنم میں چلا جائے گا یا ہدایت پا کر اُس کی سوشل حالت کو شکست آ جائے گی۔

اس کا حاصل ہماری سمجھ میں یہ ہے کہ یہ سورت اِسلام کی سوشل فتح کی خبر دینے والی ہے۔ سوشل اصلاح بھی تمام عرب کی اور خصوصاً قریش کی بدرجۂ اتم ہو جائے گی۔ یہ سوشل فتح و اصلاح نتیجہ ہے ذہنی اصلاح و انقلاب کا۔ معاشرہ ہمیشہ ذہنی انقلاب کا نتیجہ ہوتا ہے۔

اِس سورت اللہب * کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر جنگ سے کسی قوم پر دوسری قوم غالب آجائے تو دیکھنا یہ ہے کہ اگر مغلوب قوم میں معاشرت وہی رہی یعنی طبعی ضروریات پوری کرنے کا طرز وہی سابقہ رہا جیسے رسومِ نکاح و شادی اور آپس میں ملنا جلنا اور خانگی عادات وغیرہ ویسے کے ویسے رہے اور اُن کی اقتصادی حالت بھی ویسی کی ویسی رہی بلکہ جن رسوم پر اُن کے لین دین تھے وہ بھی ویسے رہے اور مال کسب کرنے کے طریقے بھی ویسے رہے تو حکیم آدمی پیشین گوئی کرے گا کہ یہ مغلوب قوم فی الواقع مغلوب نہیں ہوئی۔ چند دنوں کے بعد ویسی کی ویسی برسرِ اقتدار

---

* اگر ابو لہب بالفرض مسلمان ہو جاتا تب بھی یہ سورت ویسی کی ویسی ہی پڑھی جاتی کیوں کہ معاشرے میں جو غلطیاں سر زد ہو رہی تھیں یہ دراصل اُن پر بد دعا ہے۔

آ جائے گی۔ اور یہی فلسفہ ہے جس پر آج کل یورپ ترقی کر رہی ہے۔ مثلاً اگر [illegible] مکرمہ کی فتح کے بعد اُن کے خاندانی رسوم اور میل جول کی عادات ویسی کی ویسی رہیں اور اس کے ساتھ ہی اُن کے طریقے کسبِ رزق کے جو پہلے تھے ویسے ہی رہے (گویا پہلے کی طرح اپنے کفر پر رہے) تو چند دنوں کے بعد ویسے کے ویسے [illegible] گے اور پھر بھی مکہ پر قبضہ کر لیں گے بلکہ فاتح جماعت کا اثر بھی نہیں رہے گا۔

اہلِ مکہ کی معاشرت اور اقتصادی حالت میں ظلم بھی تھے اور خلافِ [illegible] کام تھے، تو جب تک اُن کی معاشرت اور اقتصادی حالت کی اصلاح نہ کی جائے گی تب تک اُن کے مفتوح ہونے پر کبھی اطمینان نہیں ہو سکتا (معاشرت اور اقتصادی حالت کو انگریزی زبان میں سوشیل کہتے ہیں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ [illegible] کی سوشیل اصلاح کی طرف تھی چنانچہ اہلِ مکہ کی بری معاشرت اور بری اقتصادی حالت (سوشیل) کا ایک برا نمونہ دکھا کر اُس پر بد دعا کرنی تھی کہ یہ حالت [illegible] کی نہ رہے بلکہ اصلاح پذیر ہوکر قرآن مجید کی تعلیم پر آجائے۔ یعنی اُن کی سوشیل حالت ہماری تعلیم کے آگے شکست کھاجائے۔ جیسے اسلام پولیٹیکل (جنگی) حالت سے اُن پر غالب ہوا اور وہ شکست کھا گئے، ایسے ہی اُن کی سوشیل حالت بھی شکست کھا جائے۔ اِس کا یہ مطلب نہیں کہ ابولہب پر لعن طعن ہو۔ [illegible] اُن کی معاشرت اور اقتصادی حالت کو شکست دینے کی بد دعا ہے کہ یا اللہ ان کی [illegible] حالت برباد ہوجائے اور اصلاح شدہ حالت ان پر غالب آجائے۔ نمونہ کے لیے [illegible] خاندان کو مد نظر رکھا گیا۔ اس سوشیل کی شکست تو اسی وقت ہو سکتی ہے [illegible] کہ ان میں ذہنی تبدیلی آجائے۔ اُنہوں نے جن نظریوں پر اپنی حالت بنا رکھی ہے اور جس فلسفہ پر اُن کی سوشیل حالت کا مدار تھا وہ بدل جائے*۔ آگے فلسفہ [illegible] کا سورۂ اخلاص میں کیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد انسانیت کا زیادہ مطمح نظر [illegible] سے بچنے کی طرف ہوتا ہے اور نفع کمانا تو خود بخود آ ہی جاتا ہے اور شر سے [illegible] یہ انسانیت کا اصلی تقاضا ہے۔ جس جماعت میں یہ نظریہ آجائے تو اُس کا کامیاب [illegible] یقینی ہے۔ شر سے بچنے کا مضمون سورۃ العلق میں ہے جس میں کہا گیا ہے من شر ما خلق اور اس کے بعد ہی فلسفۂ حب ہے۔ اس حب سے عدل پیدا ہوتا ہے اور یہ سورۃ الناس میں ہے۔ ذہنیت کی تبدیلی فلسفہ سے ہوتی ہے اور فلسفہ یہ ہے کہ ایک چیز کو مرکز بنا لیا جائے اور باقی اشیاء کو اس طرف راجع کر دیا جائے۔ اب ان کی [illegible] کو اِس طرح تبدیل کیا جاتا ہے کہ تمام انسانیت کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ [illegible]

---

* اس کا بدلنا اِس صورت میں ہو سکتا ہے کہ وہ نقطۂ توحید پر جس طرح قرآن حکیم کہتا ہے جمع ہو جائیں اور اس نقطۂ توحید سے جو اثرات معاشرت پر پڑتے ہیں اُن کو وہ قبول کرلیں۔

سوا کوئی شر سے بچانے والا نہیں اور وھی اللہ تعالیٰ محبوب ھے۔ آسی سے محبت رکھنی چاھیے۔ جب اھل مکہ کا فلسفہ بدل جائے گا تو ضرور اُن کی سوشیل حالت بھی بدل جائے گی اور یہ فتح جو جنگی طاقت سے اُن پر ھوئی وہ ھمیشہ کے لیے رھے گی اور قریش جماعت اسلام کی مفتوح ھو گئی۔ مثال کے طور پر لیجیے کہ ھندوستان پر پولیٹیکل فتح مسلمانوں نے حاصل کی۔ مگر ھنود کی معاشرت اور اقتصادی حالت وھی رھی اور اُن کا فلسفہ بھی وھی رھا۔ اگرچہ مسلمانوں نے ان پر غلبہ حاصل کر لیا مگر دراصل وہ مغلوب نہ ھوئے۔ اُن کی طاقت ویسی کی ویسی رھی، آخر اُنہوں نے مسلمانوں کو شکست دی۔

# سُوْرَةُ الاخلاص مكية وهى اربع آيات

سورہ اخلاص مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چار آیتیں ہیں

112

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (۱) اَللّٰهُ الصَّمَدُ (۲) لَمْ يَلِدْ وَ لَمْ يُوْلَدْ (۳) وَ لَمْ

تو کہہ وہ اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے نہ کسی کو جنا نہ کسی سے جنا اور نہیں

يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (۴)

اس کے جوڑ کا کوئی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم O

# سورۃ الاخلاص مکیۃ

گذشتہ دونوں سورتوں (اذا جاء نصر اللہ اور تبت یدا ابی لہب) میں ہم نے دیکھا کہ پولیٹیکل طاقت درحقیقت سوشیل طاقت سے پیدا ہوتی ہے - ایسے ہی سوشیل طاقت ذہنی ترقی سے پیدا ہوتی ہے - جب تک ذہن کو ایک طرف نہ لگادیا جائے اور اس کی تبدیلی نہ کی جائے تو سوشیل تبدیلی ہو ہی نہیں سکتی - اب جو ذہنی تبدیلی ہے اُس کا نام ہے فلسفہ.

ان تین سورتوں (اخلاص اور معوذتین) میں اسلام کی عقلی فتح ہے - پہلے پولیٹیکل اس کے بعد سوشیل اور آخر میں عقل - اب اس کے بعد انسانیت کے لیے کچھ اور نہیں ہے جس سے انسانیت کی اصلاح کی جائے - اسلام کے اصلی عقلی فلسفے کا خلاصہ بیان کرنے سے پہلے ایک عام قاعدہ یعنی تمہید بتانے کی ضرورت ہے -

فلسفہ کا حاصل یہ ہے کہ عقل کے سامنے ایک چیز بطور مرکز کے پیش کی جائے اور تمام چیزیں اُس میں وابستہ کردی جائیں تو فلسفہ بن جائے گا اور اس سے زیادہ فلسفہ کا مطلب نہیں ہے - یہ جو مشہور ہے کہ فلسفے کے مختلف سکول ہوتے ہیں، اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ تمام فلاسفہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ تمام چیزوں کو ایک مرکز پر جمع کر دیں (وہ مرکز جو اُن کے خیال میں ہوتا ہے) - چنانچہ ایک فلسفی یہ کرتا ہے کہ وہ اپنے خیال کے مطابق اپنے بنائے ہوئے مرکز کے ساتھ تمام چیزوں کا اتصال کر دیتا ہے - اور اِسی طرح فلسفے کے مختلف اسکول بن جاتے ہیں - مثال کے طور پر لیجیے کہ فلسفے کے ایک اسکول نے کسی ایسی چیز کو مرکز بنایا ہے کہ عام انسانیت اس کی مرکزیت کو آسانی سے قبول کر لیتی ہے - اور پھر تمام چیزوں کو عام فہم طریقہ سے اس مرکز سے وابستہ کیا جاتا ہے تو فلسفی کا وہ اسکول تمام اسکولوں کی بنسبت انسانیت کے لیے زیادہ قابل قبول ہو گا اور فلسفے کے دوسرے اسکولوں کو اس کے مقابلے میں کامیابی کی اُمید موہوم ہو جائے گی.

قرآن مجید نے اِس سورت کو اسلام کے مرکزی نقطہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے.

آیت (۱) **قل ھو اللہ احد** :- تمام عقلمند بآسانی مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے

اور آس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ عربی میں جو واحد کا لفظ ہے آس کے معنی ہیں
ایک۔ اس کے مقابلے میں اور لفظ اس مفہوم کے آسکتے ہیں مگر احد کے
کوئی لفظ آ ہی نہیں سکتا.

آیت (۲) اللہ الصمد :- صمد آسے کہتے ہیں جس کی تمام چیزیں محتاج ہوں
اور وہ کسی کا محتاج نہ ہو۔ یہ لفظ پہلے ایسی چٹان یا پہاڑ کے معنی میں استعمال
کیا جاتا تھا جس کی پناہ لے کر لشکر والے جنگ کرتے تھے یعنی لشکر کے
یہ ٹھوس طاقت، چٹان یا پہاڑی کی شکل میں ہوتی تاکہ لشکر آس کو اپنی
سمجھ کر میدان جنگ میں بے خوف لڑے اور پیچھے سے خطرہ نہ ہو۔ اس کے
صمد کا لفظ آس سردار کے لیے وضع کیا گیا جس کی پناہ میں جانے کے بعد
دشمن کا خوف نہیں رہتا اور جہاں تک آس کی زندگی کا تعلق ہے آسے کوئی
ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ اس کے بعد قرآن مجید نے اس لفظ کو اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال
کیا کیونکہ اس درجہ پناہ دینا اور کسی دوسری طاقت سے متاثر نہ ہونا صرف اللہ تعالیٰ
کی خصوصیت ہے اور کسی دوسری طاقت میں یہ بات نہیں۔ ہمارا خیال یہ ہے
یونانی فلاسفہ نے اللہ تعالیٰ کے لیے جو لفظ استعمال کیا آس کا عربی ترجمہ ہے واجب
یعنی جس کی ہستی دوسرے کی محتاج نہیں بلکہ ازخود موجود ہے۔ اسی طرح
فلاسفہ کا لفظ ہے خدا یعنی خود آمدہ۔ اس معنی کو ادا کرنے کے لیے قرآن مجید نے
صمد کا لفظ استعمال کیا۔ فلسفیانہ طور پر اس کا ترجمہ ہے واجب الوجود.

آیت (۳) لم یلد و لم یولد :- یونانی فلاسفہ کے واجب الوجود سے عقول
عقل دوم۔ عقل سوم یعنی دس تک) ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی قوتیں خارج
یعنی سب سے پہلے اللہ تعالیٰ سے عقول عشرہ جو مثل واجب الوجود کے قدیم ہیں
ہوئیں، اگرچہ یہ عقول بھی مادّہ سے پاک ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ واجب
سے یہ عقلیں خارج ہوئیں یعنی یہ عقلیں واجب الوجود سے نکلیں۔ اس سے آگے ایک
بھاری غلطی پیدا ہوئی کہ لوگ جس آدمی کو خدا کا بیٹا ثابت کرنا چاہتے ہیں
کے متعلق کہتے ہیں کہ آس کی روح میں یہ عقلیں گھس گئی ہیں۔ یہ اس لیے
کا بیٹا ہے کہ چونکہ عقل اول بلا واسطہ خدا سے پیدا ہوئی اور یہ شخص اس کا
ہے تو اس حیثیت سے اس کو خدا کا بیٹا کہنا مناسب ہے۔ مگر یہ لوگوں کی غلط
ہے۔ درحقیقت کسی فلسفی کا یہ مطلب نہیں ہے.

اسلامی فلاسفہ ان دس عقول کو خدا کی صفات کے طور پر مانتے ہیں اور
سلسلۂ عقایت کو جسے ایک عقلمند فلسفی قائم کرنا ضروری سمجھتا ہے مسلمان
اللہ تعالیٰ کی صفات میں پورا کر دیتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ تمام بڑے فلسفی

مطلب بھی تھا۔

پھر صفات الٰہی سے متعلق اس غلط فہمی کو قرآن مجید نے اِس طرح رد کیا کہ نہ تو اس کا کوئی بیٹا ہے اور نہ اُس کا کوئی باپ ہے۔

آیت (۴) و لم یکن له کفوًا احد :- اُس کے جوڑ کا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسری چیز میں یہ قابلیت ہی نہیں ہے کہ اس کو تمام چیزوں کا مرکز مان لیا جائے۔

مولوی حمیدالدین صاحب نے اس سورت کو بادشاہ کے دستخط سے تعبیر کیا ہے کہ جس طرح دستخط پہچان کے طور پر ہوتے ہیں، اِسی طرح اللہ تعالیٰ کو پہچاننے کے لیے اِس جگہ چار صفات بیان کر دی گئی ہیں۔ اور آئندہ دو سورتیں (معوذتین) اس کی ضمیمہ ہیں۔

جس طرح سورۃ اللہب سوشیل غلبہ کی دلیل ہے اسی طرح سورۃ اخلاص عقلیت کے غلبہ کی دلیل ہے۔ یہ فطری بات ہے کہ پولیٹیکل طاقت سوشیل طاقت سے پیدا ہوتی ہے اور سوشیل طاقت فلسفہ سے پیدا ہوتی ہے۔ جس کا فلسفہ اعلیٰ ہوگا اُس کی ذہنی قوتیں ضرور تکمیل کے درجے پر پہنچ جائیں گی اور ضرور ان کی معاشرت اور اقتصادی حالت بھی اچھی ہوگی کیوں کہ ذہنی قوتوں کا اثر معاشرت اور اقتصاد پر پڑتا ہے۔ اگر سوشیل حالت جو ذہنی قوتوں سے پیدا ہوتی ہے اچھی ہو گی تو اس سوشیل (یعنی معاشرہ اور اقتصاد کی اچھی حالت) سے جو پولیٹکل قوت پیدا ہوتی ہے وہ بھی اچھی ہوگی اور غلبہ پورا ہو گا۔

الحاصل قرآن مجید میں یہ دکھانا منظور تھا کہ قرآن مجید کی فتح ہوئی مگر اس فتح کو پولیٹیکل فتح تک محدود کر دینا کافی نہیں ہے اور جن لوگوں نے اسلام کو پولیٹیکل تحریک سمجھا وہ یہی کہتے ہیں کہ اِسلام کا دور گذر چکا ہے (کیوں کہ آجکل اسلام کی پولیٹیکل طاقت نہیں رہی)۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ پولیٹکل تحریک اور اس کی فتح فقط قرآن مجید کی تعلیم کا ایک حصہ ہے۔ اور پولیٹیکل تحریک اور غلبہ کی تہہ میں سوشیل طاقت کام کرتی ہے اور جو سوشیل پروگرام آج بھی دنیا میں موجود ہے اُس پر بھی قرآن‌مجید کا سوشیل پروگرام فتح مند ہے اور اسلام کے پروگرام کا اس پر بھی غلبہ ہے۔ اور ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ آج بھی دنیا بھر میں اِسلام (قرآن) سے اچھا سوشیل پروگرام کوئی اور نہیں ہے۔

سوشیل (معاشرتی و اقتصادی) طاقت ہمیشہ عقلی فلسفہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اسلام کا فلسفہ تمام دنیا کی عقلیت پر غالب ہے۔ اس کے مقابلے پر فلسفے کا کوئی اسکول پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اسلام و انسانیت لازم و ملزوم رہیں گے۔ جب

تک دنیا میں انسانیت ہے اُس وقت تک اِس سطح زمین پر اسلام کا رہنا خود انسانیت کے لیے ضروری ہے.

اس کو یوں سمجھیے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا فلسفہ اچھا ہے مگر سوشل حالت گری ہوئی ہے اور ہندوؤں کا فلسفہ ردی ہے مگر سوشیل حالت مسلمانوں کی بنسبت اچھی ہے، یعنی ایک حصہ سوشیل کا جو مال سے تعلق رکھتا ہے وہ اچھا [illegible] اب اگر مسلمانوں کی سوشیل حالت کی کوئی شخص اصلاح کر دے گا تو مسلمانوں کو اُسی وقت پولیٹیکل طاقت بھی حاصل ہوجائے گی۔ اور جس قوم کا فلسفہ ردی ہوتا ہے وہ اگر ترقی کرتی ہے تو جلد گر جاتی ہے۔ اس لیے مسلمانوں میں فقط سوشیل حالت کے انقلاب سے بڑا انقلاب ہو سکتا ہے۔

مسئلۂ واجب الوجود کو ہم نے درمیان میں چھوڑ دیا تھا۔ اِس جگہ [illegible] تحقیق کی جاتی ہے:-

انسان سب سے پہلے تصور کرتا ہے " ہونا " اور " نہ ہونا " یا " وجود " اور " عدم "۔ اور " ہونا " یا " وجود " ایک ہی چیز ہے۔ وجود کی دو قسمیں ہیں [illegible] وہ جو کبھی معدوم نہیں ہو سکتی اسے "واجب الوجود" کہتے ہیں۔ دوسری وہ ہے [illegible] معدوم ہو سکتی ہے، اسے " ممکن " کہتے ہیں۔ اِسی طرح " نہ ہونا " یا " عدم " کی بھی دو قسمیں ہیں:- ایک ایسا عدم ہے کہ اُسے کبھی وجود کی قسم میں تبدیل [illegible] ممکن ہی نہیں۔ اسے ممتنع الوجود (یعنی اس میں کبھی وجود آ ہی نہیں سکتا) کہتے ہیں۔ اور دوسری قسم ایسی ہے کہ اُس کا وجود ہونا ممکن ہے، اسے "ممکن" کہتے ہیں۔ اِسی طرح " ہونا " یا " نہ ہونا " کے مسئلہ پر غور کیا جائے تو تین قسمیں پیدا ہوتی ہیں:- (۱) "واجب الوجود" جس میں کبھی عدم آ ہی نہیں سکتا۔ [illegible] کے مقابلے میں (۲) "ممتنع الوجود" جس میں کبھی وجود آ ہی نہیں سکتا [illegible] "ممکن"۔ ممکن کی دو قسمیں ہیں اور دونوں قسمیں ایک ہی لحاظ میں آتی ہیں [illegible] ہر ایسا وجود جو معدوم ہو سکتا ہے اور ہر ایسا عدم جو موجود ہو سکتا ہے [illegible] دونوں قسموں کو "ممکن خاص" کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک "ممکن عام" ہے [illegible] کی عمومی تفسیر کی جاتی ہے کہ ہر ایسی چیز جس کا وجود ممتنع نہ ہو۔ [illegible] "واجب الوجود" اور "ممکن خاص" دونوں آجاتے ہیں، اس لیے کہ ان کا وجود ممتنع تو نہیں ہے.

ممکن عام کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ ہر ایسی چیز جس کا وجود ضروری نہ ہو اور فقط اتنی بات ہو تو اس میں "ممتنع" اور "ممکن دونوں آجاتے ہیں۔ [illegible] اور "عدم" کے متعلق یہ عقلی تقسیم ہے۔ اس سے زیادہ عقل کوئی اور قسم تجویز [illegible]

کر سکتی۔ اس میں اب "وجود" کا مرکز "واجب الوجود" ہے۔ اور "ممکن الوجود" چیزیں اس کے پرتو سے پیدا ہوں گی۔ "ممتنع الوجود" کا ہم صحیح تصور تک نہیں کرسکتے. اس کی ہستی، وجود سے اس قدر دور ہے کہ اس کے تصور کرنے کے لیے ہم چند فرضی چیزوں کے آلے بنا لیتے ہیں۔ پھر ان میں سے ایک ادھورا سا خیال دماغ میں بٹھا کر احکام جاری کرتے ہیں.

ممکن الوجود کی جو چیزیں ہیں اُن کی تقسیم اور ہے۔ ایک ایسا بھی ممکن الوجود ہے جس کے وجود کی ابتدا اور انتہا نہیں۔ اگرچہ وجود ان کو واجب الوجود کے فیض سے ملا ہے۔ اور دوسری ممکن چیزیں ایسی ہیں کہ ان کی ابتدا اور انتہا بھی ہے کہ پہلے نہیں تھیں، پھر ہوگئیں اور پھر نابود ہوگئیں وغیرہ ۔ یہ مسئلہ بھی فلسفہ میں ایک طرح پر طے شدہ ہے کہ جس کی ابتدا نہیں، اُس کی انتہا نہیں ہوسکتی اور جس کی انتہا ہے اُس کی ابتدا ضرور ہو گی.

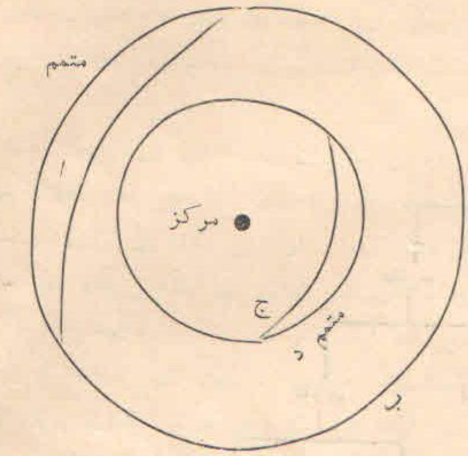
"واجب الوجود" کے عوض قرآن مجید نے لفظ **صمد** لیا ہے۔ چونکہ واجب الوجود کا سمجھنا ایک خاص علمی اصطلاح پر مبنی تھا اِس لیے عام لوگ اس کے مخاطب نہیں ہو سکتے۔ اس لیے لغت میں سے ایک لفظ چھانٹ لیا گیا ہے جس کے اندر واجب الوجود کے معنے خود بخود آ جاتے ہیں۔ یونانی فلاسفہ کہتے ہیں کہ جب ایک چیز کی حقیقت سمجھنی منظور ہو تو ارسطو نے اس کے متعلق دس سوال مقرر کر دیے ہیں کہ یہ دس سوال دریافت کر لو اس کے بعد اس کی حقیقت واضح ہو جائے گی۔ ان کے نام ہیں "مقولات عشرہ، یعنی (۱) وضع (مکان کی شکل سے نسبت ہے اور مکان سے اونچی چیز ہے۔ پہلا آسمان ہے اُس کے اوپر دوسرا آسمان ہے حتیٰ کہ سب سے آخری آسمان ہے۔ اُس کا جو اوپر کا حصہ ہے اُسے وضع کہتے ہیں)۔ (۲) آین (کہاں ہے) (۳) متی (کب سے ہے)۔ (۴) کیف (کیسا ہے)۔ (۵) کم (کتنا ہے)۔ (۶) **الجوہر** (قائم بالذات یعنی جو اپنے پر قائم ہے)۔ (۷) الاضافۃ (دوسرے سے کیا نسبت)۔ (۸) **الملک** (مثلاً کپڑا اور قمیص وغیرہ کسی کی ملکیت ہے) (۹) **الفعل** (دوسری چیز میں اثر کرنا)۔ (۱۰) الانفعال(دوسری چیز سے اثر قبول کرنا)۔ جب اِن دسوں کے جواب مل جائیں تو پھر اس چیز کو معین کہا جا سکتا ہے۔ اس کا نام ہے مقولات عشرہ۔ سوال اِس طرح ہو گا:- ماھو، پھر آین ہو، پھر متی ہو، علی ھذا القیاس.

اب دس عقول کی تفصیل بیان کی جاتی ہے.

سب سے اول واجب الوجود سے جو صادر ہو گا اُس کو "صادر اول" کہتے ہیں یعنی ظاہر ہوئی۔ ایک چیز جو چھپی ہوئی تھی وہ ظاہر ہوگئی۔ واجب الوجود میں سارے کا سارا وجود محفوظ ہے ۔ اس کا کوئی حصہ ظاہر ہو جائے گا تو پھر اُس کا

اپنے موقع پر جانا ضروری ہے۔ واجب الوجود سے باہر وجود کا ایک ذرّہ بھی [illegible]
اس لیے وجود کو یوں کہنا پڑے گا کہ وہ واجب الوجود سے صادر یعنی ظاہر [illegible]
تو سب سے پہلی چیز جو ظاہر ہوتی ہے وہ نور محض ہے اور وجود کے جتنے [illegible]
واجب الوجود سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے صادر ہوتے رہیں گے وہ سب اُسی صادر اول [illegible]
محض) سے ظاہر ہوں گے۔ یعنی اب آئندہ تمام چیزیں اس صادر اول کے وسیلے سے [illegible]
ہوں گی اور واجب الوجود سے براہ راست ظاہر نہیں ہوں گی۔ اس کو عقل اول [illegible]
جاتا ہے۔ یہ ظلمت اور جسمانیات سے پاک ہے۔ اس لیے اس کے لیے عقل کے سوا [illegible]
اور لفظ مناسب نہیں ہو سکتا۔ صادر اول (نور محض) کے مسئلہ میں دنیا کا [illegible]
عقلمند اختلاف نہیں رکھتا۔ تمام عقلمند اس کو اسی طرح مانتے ہیں۔ اگر کسی [illegible]
اختلاف ہوتا ہے تو صرف نام کا اختلاف ہوتا ہے۔ کسی عقلمند نے اس کا [illegible]
اول رکھ دیا ہے اور کسی نے کچھ اور۔ (ہندو فلسفے میں اس کا جو [illegible]
اپنی جگہ بیان ہو گا) ورنہ حقیقت میں یعنے معنی کے لحاظ سے سب متفق [illegible]
اس عقل اول کے بعد یونانی فلاسفہ نے جس طرح خاکہ کھینچا ہے اُس پر تمام [illegible]
کی موافقت ضروری نہیں ہے۔

یونانی فلاسفہ کو ستاروں اور آسمان کی رصد گاہ قائم کرنے میں سات [illegible]
معلوم ہوئے جو باقاعدہ حرکت کرتے ہیں:- (۱) سورج (۲) چاند (۳) زہرہ (۴) [illegible]
(۵) زحل (۶) مریخ (۷) عطارد۔ پھر ایک سیارہ دوسرے کو چھپا لیتا ہے جسے [illegible]
کہتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے ان کے مدارج مقرر کیے ہیں کہ سب سے [illegible]
ہے اور سب سے آخر زحل ہے۔ اُن کی حرکتیں باقاعدہ کرنے کے لیے ان کا [illegible]
طرح پر ہے کہ ایک شفاف گول کرّہ ہے اور اس میں ایک ایک سیارہ ٹھونکا [illegible]
یعنی اس گول شفاف کرّے کے اندر ایک ایک سیارہ قائم کردیا گیا ہے۔ [illegible]
ابتدائی نظریات میں یہ مقرر ہے کہ گول کرّہ کے سوا باقاعدہ حرکت اور کوئی [illegible]
سکتا۔ کرّہ اپنے مرکز پر ایک ہی قاعدہ سے متحرّک رہ سکتا ہے۔ چونکہ [illegible]
ایک دوسرے کی نظر کو روکتے نہیں اور پردہ نہیں بنتے اس لیے ان کو [illegible]
گیا ہے۔ اور چونکہ ان سیاروں کی حرکتیں گول نہیں ہوتیں اس لیے ہر کرّہ کے [illegible]
ٹیڑھے کرّے اور فرض کرنے پڑے۔ اور اِس طرح ان کی حرکتوں کو باقاعدہ [illegible]
گیا ہے کہ مرکز ایک ہی رہے گا جس پر وہ حرکت کر رہے ہیں۔ اِسی طرح [illegible]
نے سات فلک مانے۔ فلک کہتے ہیں چرخے کے اُس گول حصے کو جو [illegible]
پھرانے سے پھرتا ہے۔



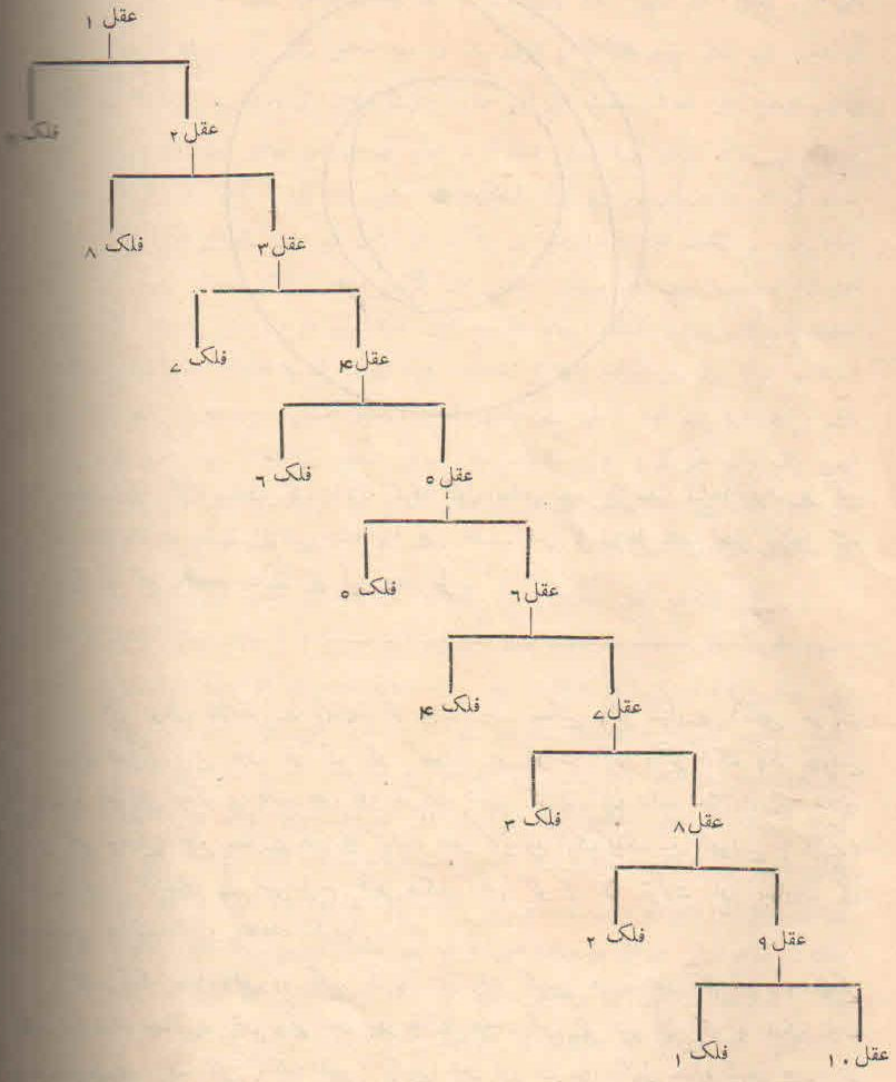

ب۔ بڑا گول شفاف کرہ. د۔ کرہ گول شفاف ج۔ یہ حصہ ٹیڑھا کرہ ہے اور حرکت کو باقاعدہ بنانے کے لیے بنانا پڑا ہے. الف۔ اس کا ٹیڑھا حصہ یعنی ٹیڑھا کرہ جو حرکت کو باقاعدہ بنانے کے لیے بنانا پڑا.

---

غرض یونانی فلاسفہ نے دیکھا کہ بہت سے چمکنے والے ستارے اکٹھے حرکت کرتے دکھلائی دیتے ہیں تو اُن کو انھوں نے ثوابت کہا یعنے ایک جگہ ٹھونسے ہوئے۔ وہ اپنی جگہ پر قائم ہیں اور حرکت نہیں کرتے۔ ان سات سیاروں کے علاوہ جس قدر چمکنے والے ستارے ہیں وہ ثوابت ہیں اور وہ ایک فلک میں ٹھونسے (گاڑے) ہوئے ہیں. آنہوں نے اس طرح آٹھ فلک فرض کرکے ان ثوابت اور سیاروں کی خصوصی حرکتوں کو باقاعدہ کردیا.

اب ایک چیز باقی رہ گئی کہ یہ دن رات کیسے ہوتے ہیں کہ ہم ۲۴ گھنٹے میں یہ تمام سیارے اِس چکر میں پھر جاتے ہیں۔ اس کے لیے ان کو ۹ فلک ثابت کرنے پڑے۔ ان کو "فلک اطلس" کہتے ہیں اور ان میں کوئی سیارہ نہیں ہے۔ تو اس طرح نو (۹) فلک مان کر انھوں نے موسموں اور دن رات کا صحیح "تخمینہ بنا لیا اور اپنا علم ہیئت مکمل کر لیا۔ یہاں تک پہنچنے کے بعد ان کا ایک نیا نظریہ پیدا ہوتا ہے کہ عقل اول سے دو چیزیں نکلیں (۱) عقل ثانی اور (۲) نواں فلک۔

یعنی یہ دونوں عقل اوّل سے نکلے۔ باقی عقول اور فلک ان سے اسی طرح بتدریج نکلتے گئے .




فلک نمبر ایک اور عقل نمبر دس کے نیچے عناصر ہیں اور ان کو چار حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے جسے اربعہ عناصر کہتے ہیں۔ ۱- ہوا ، ۲- آگ ، ۳- پانی ، ۴- مٹی۔ یہ عقل نمبر ۱۰ نے پیدا کیے ۔ غرض ان اربعہ عناصر کا مشترکہ مادہ عقل

نمبر ۱۰ سے پیدا ہوا۔ اسی پر فلکوں کی حرکتوں کا اثر پیدا ہوا اور اس پر مختلف رنگ پیدا ہونے شروع ہوئے۔ اس رنگ کو صورت کہتے ہیں جو مادہ کا خاص رنگ لے کر ایک مخلوق بن جاتی ہے۔ سب سے پہلے چار صورتیں ظاہر ہوئیں جن کا نام اربعہ عناصر ہے۔ پھر انہی کی ترکیب سے معدنیات، نباتات، حیوانات اور انسان پیدا ہوئے۔ *

یونانی فلسفہ یوں تو بنی امیّہ کے زمانے ہی سے آہستہ آہستہ عربی میں داخل ہونے لگا تھا اور خاص خاص لوگ اس سے آشنا تھے لیکن خلیفہ مامون کے زمانے سے مستقل طور پر عربی میں منتقل ہوا۔ اور اسی خلیفہ کے زمانے میں عربی تراجم کی وجہ سے اس کا عام رواج ہوا۔ اور اسی زمانے سے مذہبی عالم اور حکیم دو حصوں میں بٹ گئے۔ اس سے پہلے فقط ایک نام تھا کہ جو سمجھدار ہوتا وہ فقیہ کہلاتا اور عام آدمی غیر فقیہ کہلاتے۔ ہمارے مفسرین نے دیکھا کہ قرآن مجید میں سات آسمانوں، ایک کرسی اور ایک عرش کا ذکر ہے تو حکمائے یونان کی طرح جنھوں نے (۹) نو فلک قرار دیے تھے انھوں نے بھی سات آسمان ایک کرسی اور ایک عرش ملا کر نو آسمان بنا دیے۔ یہ قرآن مجید کی غلط تفسیر ہے۔ اس قسم کا ایک اور غلط استعمال ہوا وہ یہ کہ یونانی فلاسفہ نے چونکہ ہر فلک کو بارہ (۱۲) حصوں (ٹکڑوں) میں تقسیم کر رکھا ہے اور وہ ہر ایک حصہ کو بارہ برج کہتے ہیں تو قرآن مجید میں لفظ بروج (والسماء ذات البروج) کو بھی ہمارے مفسرین یونانی اصطلاح میں لے آئے۔ یہ دوسری غلطی ہے۔

یونانی فلاسفہ کا یہ نظریہ ہے کہ عقول اور افلاک کے لیے ابتدا اور انتہا نہیں ہے۔ یہ اگرچہ ممکن چیزیں ہیں مگر قدیم ہیں ان کا یہی نظریہ ہے۔ اس نظریہ کو ماننے کے بعد جسمانی حشر اور جسموں کا جنّت اور دوزخ میں جانا ممکن نہیں رہ جاتا۔ اسی زمین پر ایک ٹکڑے کا نام جنّت اور دوزخ رکھ دیا جائے تو یہ قرآن مجید کی غلط تفسیر ہو گی اور افلاک پر جنّت ماننا اور افلاک کے نیچے دوزخ ماننا یہ اس نظریہ کے ماتحت معقول ہو ہی نہیں سکتا۔ اس قسم کی پیچیدگیوں نے مسلمان حکماء کا ایک ایسا طبقہ پیدا کردیا جو یونانی فلاسفہ کے ان نظریات کو پوری طرح تسلیم نہیں کرتا۔ وہ صرف بنیادی چیزیں مان لیتے ہیں مگر جس شکل سے یونانی فلاسفہ ان کی تفسیر کرتے ہیں مسلمان حکماء ان کو نہیں مانتے۔ امام غزالی اس قسم کے

---

* مجلس میں جب ادنیٰ درجے کے شاگرد موجود تھے تو مولانا نے تنزلاً یہ تقریر فرمائی اور میں تو:-

ع آنچہ استادِ ازل گفت ہماں می گویم

حکماء کے ایک بہت بڑے پیشوا ہیں مگر بدقسمتی سے امام غزالی بھی [illegible]
کے مقابل کوئی مکمل نظریہ پیش نہیں کر سکے۔ اس لیے مسلمان حکماء [illegible]
کوئی صحیح قواعد پر مکمل نہیں ہو سکیں۔

پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ عقل اول کے ماننے میں کوئی فلسفی [illegible]
کرتا مگر یونانی اس کے بعد نو (۹) عقول مانتے ہیں۔ اس کی اصل وجہ [illegible]
کی حقیقت کا نظریہ نو (۹) افلاک پر مرتّب ہوتا تھا۔ اگر آن میں [illegible]
پیدا ہو جائے جو نویں فلک سے زیادہ ماننے پر مجبور ہو جائے تو وہ [illegible]
عقول بھی آسی قدر زیادہ مانے گا۔ مطلب یہ ہے کہ عقول کی تعداد [illegible]
سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ آسمانوں کی ایسی ہیئت معین کرنے کے بعد ہی [illegible]
پیدا ہوا۔

ہندوستان اِس مسئلہ میں کسی سے کم نہیں تھا۔ افلاطون کہتا ہے [illegible]
ریاضی ہندیوں کے سوا اور کوئی جان ہی نہین سکتا۔ آسمان کی اس ہیئت [illegible]
ہندوستانی نظریہ بالکل نیا ہے۔ اسے وہ ایک ایسا نورانی لطیف جسم [illegible]
آکاش کہتے ہیں جو ہوا سے زیادہ لطیف اور سورج سے زیادہ نورانی ہے [illegible]
کا فیض ہے جو آکاش کو پیدا کیا ہے۔ آکاش میں یہ تمام سیارے [illegible]
اس آکاش کی قوت کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ باقاعدہ حرکت نہیں کرتے۔ [illegible]
تو الگ رہے آنہیں ایک فلک کو ماننے کی بھی ضرورت نہیں ہے اور [illegible]
کو نہیں مانتے۔ ہر متحرک چیز کے ساتھ وہ اس کی ایک خاص روح [illegible]
یہ کہ اس روح کے ذریعہ سے عقل اول کا فیض اس جسم تک پہنچتا رہتا ہے۔ [illegible]
بعد ہندو فلاسفہ نے بھی اِس فضا کو جسے آکاش کہتے ہیں سات [illegible]
سات حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ فضا کے ایک طبقہ کو آسمان کہتے ہیں۔ [illegible]
فلسفہ یا ہندی حکماء کی حکمت قدیم زمانہ سے لے کر آج تک چلی آتی ہے

ایران دونوں فلسفوں (یونانی و ہندوستانی) کا مجموعہ تھا۔ [illegible]
اہل عرب یونانی فلسفے کی بنسبت ہندی فلسفے کی طرف زیادہ مائل تھے۔ [illegible]
کے بعد ایران میں ایسے عالم پیدا ہوئے جو اس ہندی فلسفہ کو جس کے [illegible]
کا بھی ایک حصہ موافق تھا خوب اچھی طرح جانتے تھے۔ آنہوں نے [illegible]
کو رد کر کے اس کی جگہ اسلامی تشریحات کے لیے ہندوستانی فلسفہ [illegible]
فلسفہ سمجھیے ایک ہی بات ہے) کو پیش کر دیا۔ اس میں ایک [illegible]
شہاب الدین سہروردی مقتول رح تھے۔ یہ حکیم سلطان صلاح الدین ایوبی کے [illegible]
گذرے ہیں۔ یہ ایک بڑے حکیم تھے اور ایرانی فلسفہ خوب جانتے تھے۔ [illegible]

ـلامی تعلیمات کی تشریح ایرانی فلسفے کے مطابق کرنی شروع کی۔ مگر مشکل یہ آن
ی کہ مامون الرشید کے زمانے سے لے کر اُس زمانے تک جو علم الکلام مسلمانوں میں
رتب ہو چکا تھا وہ اُن نظریات کے مطابق تھا جو ارسطو وغیرہ کے نظریے تھے۔ یعنی
ن کا علم الکلام شہاب الدین کے نظریات سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا کیوں کہ شہاب الدین
کے نظریات کے تحت اسلامی تعلیمات بہت وضاحت سے سمجھ میں آسکتی تھیں۔ جن
ـسائل کو متکلم حل نہیں کر سکتے تھے یہ نہایت آسانی سے ان کو حل کردیتے۔
مگر بد قسمتی سے سلطان صلاح الدین اس پہلے یونانی فلسفے پر جس پر مسلمانوں نے
پنی عمارت کھڑی کی تھی شرعی طور پر عقیدہ رکھتا تھا۔ اس لیے علماء نے سلطان
صلاح الدین کو سمجھایا کہ شہاب الدین اِسلام کی تردید کرتا ہے۔ اِس واسطے اُنہیں
تل کردیا گیا۔

اس کے بعد ہلاکو کا بغداد پر حملہ ہوا۔ اس زمانہ میں اس کا وزیر نصیرالدین
طوسی تھا جو مذہباً شیعہ تھا اور ارسطو کے فلسفہ کا معتقد تھا۔ ابن سینا جو ارسطو
کے فلسفے کا اچھا شارح ہے، اُس کے فلسفے کا معتقد تھا۔ ہلاکو کی سلطنت کے ساتھ
ساتھ نصیرالدین طوسی کا علمی عروج انتہا تک پہنچا۔ اب علماء اور حکماء اہل سنت
والجماعت بہت پریشان ہوئے کہ اگر وہ ارسطو کے فلسفے کو رواج دیتے ہیں تو اس
کے اندر شیعہ پن رواج پاتا ہے۔

نصیرالدین طوسی کا شاگرد علامہ قطب الدین شیرازی ہے۔ اُس نے شہاب الدین کے
ـسفے کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ شہاب الدین مقتول کا فلسفہ جو دراصل ہندوستانی فلسفہ
تھا قطب الدین شیرازی کی تشریح کے بعد علماء میں بہت مقبول ہو گیا۔ علماء کو
سب سے زیادہ فائدہ یہ ملتا تھا کہ اُس سے انسان شیعہ نہیں بنتا تھا۔ ایرانی حکماء
س زمانہ میں قدیم ایران پر فخر کرتے تھے اور اُن کا مقابلہ تاتار سے تھا۔ اس واسطے
تار کے مقابلہ میں ایرانی حکماء میں نیشنلزم پیدا ہو گئی جو پہلے دبی ہوئی چیز
ی۔ یہ پہلے اسلام سے مقابلہ نہیں کر سکتے تھے مگر اب وہ زور پکڑ گئے۔ اس
کی تاثیر سے شہاب الدین مقتول کا فلسفہ (جسے ہندوستانی یا ایرانی نام سے تعبیر کیجیے)
یادہ پھیل گیا۔

علامہ قطب الدین شیرازی کے بعد اس فلسفہ کا سب سے بڑا علمبردار جلال الدین
دوانی ہے جو شیراز کا ایک زبردست عالم تھا۔ جلال الدین دوانی کا شاگرد میر
فتح اللہ شیرازی ہے جو اکبر بادشاہ کا نورتن تھا۔ یعنی ایک واسطے سے وہ جلال الدین
دوانی کے شاگرد کا شاگرد ہے۔ اِسی طرح شیخ مبارک (ابوالفضل اور فیضی کا باپ)
جلال الدین دوانی کے دوسرے شاگرد کا شاگرد ہے۔ میر فتح اللہ اور شیخ مبارک نے

جب شہاب الدین مقتول کے فلسفہ پر نظر ڈالی اور اس کے ساتھ ہی آنہوں نے عثمانی
کا فلسفہ دیکھا تو آنہیں علم ہوا کہ وہ یونانی فلسفہ کے زمانہ میں ایک نہر کے
کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے اور اب ہندوؤں کے فلسفے کے زمانے میں ایک سمندر کے
کنارے پر تھے - اکبری دربار کے انقلاب کی یہی روح تھی .

اس فلسفہ کے رواج سے ہندوستان میں مذہبی قوت کو جس قدر صدمہ پہنچ سکتا
تھا پہنچا - اور امام ربّانی رحمۃاللہ علیہ نے آس کی تلافی کردی - اور اس صدمہ سے
ہم کو بچا لیا - امام ربّانی رح کی زیادہ تر توجہ اشراق (کشف) سے متعلق ہے - اشراق
کا مطلب ہے طلوع نور جو مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور یہی مطلب کشف کا ہے
امام ربانی کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں میں ایسے فاضل پیدا ہوئے جو یونانی اور
ہندوستانی فلسفہ اور امام غزالی رحمۃاللہ علیہ اور جلال الدین دوّانی کی تحقیقات اسلامی
کے ماہر تھے - اس جماعت کے علمبردار بعد میں شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ العزیز ہوئے
ہوئے - آنہوں نے اپنا اسلامی فلسفہ مکمل کر لیا جس میں بعض چیزیں ارسطو کی باقی
رہ گئیں اور باقی چیزیں ایرانیوں سے لیں اور بعض چیزیں ہندو فلسفے سے اخذ کر لیں
شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ العزیز مکہ میں دینی علوم کے بہت بڑے ماہر تھے اس لیے
وہ ہر جزوی مسئلہ کو تفصیل سے بیان کرتے تھے .

شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ العزیز کے ہاں افلاک کا نظریہ باقی نہیں رہا - ان
کے ذہن کو ہندی اور یونانی فلسفہ زیادہ اپیل کرتا ہے - شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ
نے ستاروں کو قرآن کے ترجمہ میں "تیرتا ہوا" ذکر کیا ہے .

شاہ ولی اللہ قدس سرہ العزیز کے زمانہ کے بعد ہندوستان کا یوروپین سائنس سے تصادم
ہوا - اس حملہ کی برداشت فقط شاہ ولی اللہ صاحب کے فلسفہ میں تھی مگر بدقسمتی سے
جس طرح مسلمانوں کی سیاست بکھر گئی تھی اسی طرح آن کی علمی قوّت بھی پریشان
(منتشر) ہو چکی تھی - اس واسطے وہ ایک راستہ سے جلدی سے سیدھے نہیں چل سکے

سر سید اور آن کے ساتھیوں نے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفہ سے کام لینا
شروع کیا - ان کے فلسفے میں آن کو بہت سی ایسی چیزیں ملیں جن کا جاننا
ضروری تھا - اس کے عوض وہ یوروپین فلاسفی کی نئی چیزیں پیش کر سکتے تھے - اس
سے عام مذہبی طبقہ بھڑک آٹھا - جس طرح سلطان صلاح الدین کے زمانہ میں ہوا تھا
یعنی ایک طرح کا جمود پیدا ہوا تھا - نئی تحریک سے پہلے سر سید کی اوائلی تعلیم
و تربیت شاہ ولی اللہ کے اسکول میں ہوئی - سر سید نے (۱) شاہ مخصوص اللہ بن شاہ
رفیع الدین (جو شاہ عبدالعزیز کے شاگرد تھے) سے تعلیم حاصل کی - اور (۲) مولانا
مملوک علی صاحب سے بھی جو مولانا رشیدالدین کشمیری، پرنسپل عربک کالج دہلی

کے شاگرد تھے۔ پھر (۳) عقلی اور ادبی فنون شاہ رفیع الدین سے حاصل کیے جو شاہ عبدالعزیز کے چھوٹے بھائی تھے۔ مولانا رشیدالدین صاحب کشمیری کو شاہ عبدالعزیز نے خاص طور پر تربیت دی تھی۔ اور انہوں نے اسی طرح مولانا مملوک علی کو تیار کیا تھا۔ مگر سرسید کے تمام ساتھی اس اسکول کے نہیں ہیں۔ جس قدر فرصت ایک نئے فلاسفر کو ایک نیا نظریہ سوچنے کے لیے ملنی چاہیے ہمارا خیال ہے کہ سیاسی جھمیلوں کی وجہ سے سرسید کے لیے ممکن نہیں تھی۔ اگر سید محمود کی زندگی دوسرے طریقہ سے نکمّی نہ بنا دی جاتی تو ہمارا خیال ہے کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں میں صحیح اور بہترین فلاسفر ہوتے اور یورپ کے سامنے اسلام کو پیش کرنے کی اُن میں سب سے زیادہ قابلیت ہوتی۔ اُنہیں چند اسلامی مسائل پر غور کرنے کا موقع ملا تو اُنہوں نے اپنے والد کی تمام خامیاں دور کر دیں اور جس عالم نے اُن کی بات سنی وہ عش عش کرنے لگا۔

مولوی عبدالحق صاحب دہلوی (مفسر حقانی) ایک دفعہ سرسید کے ہاں مہمان تھے۔ سرسید اُن کو جب کالج کی عمارت دکھلا کر واپس کمرے میں لائے تو سرسید نے کہا مولانا! یہ عمارت آپ کو رو رہی ہے (یعنی آپ کے جھگڑوں کے سبب ناقص رہ گئی ہے) تو مولانا عبدالحق صاحب نے فرمایا کہ اگر آپ اس قسم کا یورپین فلسفہ مسلمانوں کے سامنے پیش نہ کرتے تو مسلمان آپ کو یہ کالج سونے کا بنا دیتے۔ اُس وقت سید محمود صاحب نے جو دوسرے کمرے میں تھے یہ بات سنی تو آکر کہا کہ مولانا میں اِن مسائل میں اپنے والد کے ساتھ نہیں ہوں۔ مگر افسوس کہ اُن کی زندگی نے وفا نہ کی۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ سید محمود نے اِسلامی فقہ پر جو تھوڑا بہت لکھا ہے وہ ایک بہترین نمونہ ہے۔

سرسید کے زمانہ میں شاہ ولی‌اللہ کے پس ماندہ لوگوں میں ایک حکیم پیدا ہوئے جن کا نام مولانا محمد قاسم قدس سرہ العزیز تھا۔ وہ مدرسہ دیوبند کے بانی اور علوم اِسلامیہ کے ازسرنو اشاعت کرنے والے تھے لیکن آپ کے دماغ میں سیاسی مخالفت کی تلخی نے گنجائش نہیں چھوڑی تھی کہ آپ یورپین سائنس پر غور کرتے۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ آپ شاہ ولی اللہ صاحب کے اسکول کے بہترین ترجمان تھے اور آپ نے اپنے شاگردوں کی ایک کافی تعداد چھوڑی۔ آج ہندوستان کی مذہبی علمی قوّت کا اچھا بقیہ وہی لوگ ہیں جو اپنے آپ کو شاہ ولی اللہ صاحب سے مربوط جانتے ہیں۔

# سُورۃ الفلق مدنیۃ وھی خمس آیات

سورہ فلق مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی پانچ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (۱) مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ (۲) وَ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا

تو کہہ میں پناہ میں آیا صبح کے رب کی، ہر چیز کی بدی سے جو اس نے بنائی اور بدی سے اندھیرے کی جو

وَقَبَ (۳) وَ مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ (۴) وَ مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ (۵)

سمٹ آئے اور بدی سے عورتوں کی جو گرھوں میں پھونک ماریں اور بدی سے برا چاہنے والے کی جب لگے ٹوک لگانے

# سورة الفلق مكية او مدنية

سورة‌الفلق اور سورة‌الناس کی یہ تفسیر حضرت مولانا محمد قاسم قدس سرہ العزیز کی تقریر کا خلاصہ ہے۔ یہ تفسیر مولانا شبیر احمد صاحب نے حاشیہ ترجمہ مولانا شیخ الہند قدس سرہ‌العزیز پر لکھ دی ہے.

فلسفہ کا اہم حصہ یہ ہے کہ تمام کائنات کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ اس کے متعلق اِس سورت میں بحث ہے۔ یعنی تمام مخلوقات کو ایک مرکز سے ربط دے دینا اِس سورت میں بتلایا گیا ہے.

یہ ایک فطری بحث ہے کہ تمام کائنات میں انسان اپنی ضرورت کے مطابق اِن چیزوں کے متعلق غور کرتا ہے اور اِس سے زیادہ اس میں دماغی قوت ھی نہیں یعنی جن چیزوں کی اسے ضرورت ہے انہی کے متعلق وہ غور کرتا ہے اور باقی کے متعلق نہیں کرتا۔ کیونکہ انسان میں یہ فطری تقاضا ہے کہ پہلے وہ شر سے بچنے کی تجویزیں سوچتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ جس چیز کا میں تم کو حکم دوں تم اپنی توفیق، طاقت اور استطاعت کے موافق اطاعت کرو اور جس سے میں منع کروں اس سے بالکل ہٹ جاؤ، کیونکہ ضرر دینے والی اشیاء سے بچنا ضروری ہے۔ جب شر سے بچ گیا تو آگے منفعت کے ہزاروں دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ گویا یہ سورت فلسفہ وحدت‌الوجود کا تتمہ ہے جو سورة اخلاص میں تھا.

آیت (۱) قل اعوذ برب الفلق :- چیر کر پیدا کرنے والے کی پناہ میں آتا ہوں۔ تمام مخلوقات ایک دوسرے سے چیر کر پیدا ہوتی ہے۔ چیر کر پیدا کرنے والا تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس کی پناہ میں آتے ہیں کہ دنیا کی کوئی چیز ہمیں ضرر نہ پہنچائے۔ ہر چیز کے اول درجہ کا فائدہ یہی ہے کہ اس سے ضرر نہ پہنچے۔ مادّہ جب مرکّب ہوتا ہے تو اس کے لیے صورت لازمی ہے اور وہ تیسری چیز بن جاتی ہے۔ یعنی مادّہ و صورت مل کر تیسری چیز بن جاتی ہے یہ خلق ہے.

آیت (۲ تا ۴) من شر ما خلق و من شر غاسق اذا وقب الآیات :- مخلوقات کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور اِن آیات میں ایک ایک حصہ کا ذکر کیا

گیا ہے۔ مگر اتنے مشکل مضمون کو آسان کرنے کے لیے انسان کو نبات فرض کر لیا گیا ہے۔ جیسے آم یا کھجور کا درخت۔ جب انسان کو نبات کی حیثیت میں فرض کر لیا گیا تو اب یہ بتلانا مقصود ہے کہ اُسے کون سی چیزیں نقصان پہنچاتی ہیں۔ ان پر اب درجہ وار بحث ہو گی۔

درخت کے لیے سب سے پہلے وہ چیز نقصان دہ ہے جو سبزہ (نباتات) کو کھا جائے یعنی اُس چیز کو اس سبزہ کے کھانے سے فائدہ ہو اور نباتات کو نقصان ہو۔ سبزہ خور جانور نباتات کو اِس غرض سے نہیں کھاتے کہ نبات (سبزہ) کو نقصان پہنچائیں بلکہ اِس واسطے کھاتے ہیں کہ اُن کی ضرورت اِس سبزے سے پوری ہوتی ہے۔ اِسی واسطے کاشتکار کھیتی کے اِرد گرد باڑ بنا لیتے ہیں تاکہ سبزہ خور جانور سبزہ نہ کھا سکیں۔

من شر ما خاق :- اِس آیت میں ارشاد ہے کہ ہر اُس چیز سے جو شر سے پیدا کی گئی ہے۔ عربی ترکیب اگر اس طرح کی ہو جس طرح اِس آیت میں ہے تو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ اس کی پیدائش کا تقاضا ہے کہ ہمیں ضرر پہنچائے جیسے سانپ بچھو وغیرہ۔ اِس قسم کی تمام مخلوقات کے شر سے ہم اللہ کی پناہ میں آتے ہیں۔

و من شر غاسق اذا وقب :- ڈوبنے والی چیز جس سے تاریکی پیدا ہو۔ حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چاند کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ ہے غاسق۔ اس سے اشارہ ہے تمام ایسی قوتوں کی طرف جن کے نہ ہونے سے ہمیں ضرر پہنچے۔ جیسے نباتات کو پانی یا غذا نہ ملے تو وہ سوکھ جاتے ہیں اور چاند کی روشنی نباتات کو ایک طرح کی زندگی بخشتی ہے تو جب یہ گم ہو جائے گی تو زندگی کا ذریعہ نہ ہونے سے نباتات کو ضرر پہنچے گا۔ اِسی طرح ہماری ضروریاتِ زندگی نہ ہونے سے جتنے ضرر ہمیں پہنچ سکتے ہیں اُن سے بھاگ کر ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آتے ہیں کہ وہ ہمیں ان ضرروں سے بچائے اور ہماری زندگی کی جس قدر ضروریات ہیں اُنہیں ہمارے لیے مہیا کر دے۔

آیت (۴) و من شر النفاثات فی العقد* : اور ہمیں ان جماعتوں کے شر سے ...

---

* نبات یا اشجار جب دو پتّی ہوتے ہیں تو اس جگہ گرہ ہوتی ہے، پھر اشجار میں جہاں شاخ نکلتی ہے وہاں گرہ ہوتی ہے تو ان گرہوں کے زور اور طاقت سے پانی صاف ہو کر اوپر جاتا ہے اور پھر وہ بارآور ہوتے ہیں۔ انسان کے اعتقادات بھی اسی طرح ہیں۔ اگر ان اعتقادات میں کسی کی نفث سے خرابی آجائے تو اس کی تمام ترقی بند ہو جاتی ہے حبطت اعمالہم۔ اعمال کے وزن، ثقل اور عفت کی بنا اعتقادات پر ہیں۔ بغیر اعتقاد کے عمل ھباء منثوراً ہیں۔ انما الاعمال بالنیات۔

کوئی بھی چیز شر سے پیدا نہیں کی گئی ہے لیکن ہر چیز میں کسی نہ کسی کو کوئی نقصان پہنچانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اسی لئے اللہ رب العزت کی پناہ مانگتا ہوں ہر چیز کے (جو پیدا کی گئی ہے) شر سے۔

جو پھونک مار مار کر عقلی عقیدے کو کمزور کردیتے ہیں ۔ ہمارے مفسّرین یہاں کئی روایتیں لکھ دیتے ہیں جن کی صحت کے متعلق ہمیں اس جگہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر ان سے جو نتیجہ وہ نکالتے ہیں وہ قرآن مجید سے ربط نہیں کھاتا۔ جیسے ایک عورت جادوگرنی فرض کر لی جاتی ہے (بقول انکی روایت کے) کہ وہ اپنی بتوں سے جادو کراتی ہے اور اب قرآن مجید میں اس کے شر سے پناہ مانگی جا رہی ہے۔ اس کی اس قسم کی تاویل اگرچہ ہو سکتی ہے کہ اس کا آیت سے تعلق پیدا کردیا جائے مگر ہمارا ترجمہ بہت صاف ہے۔ اس آیت سے جادوگرنیاں مراد لینا قرآن مجید سے ثابت نہیں ہوتا۔ اور یہ قرآن یا نبوت کی شان کے خلاف بھی ہے۔ ہم عورتوں کی جگہ جماعتوں کو لیتے ہیں اور جماعت کو عربی میں مؤنث کے صیغے میں لیا جاتا ہے یعنی اُن جماعتوں کے شر سے پناہ مانگی جاتی ہے جو اپنے غلط پروپیگنڈے سے انسان کی فطری ترقی کو روکتی ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہندوستان میں پروپیگنڈا کیا گیا کہ یورپین اقوام بہت بڑی چیز ہیں اور ہندوستانی ان کا کبھی مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس غلط پروپیگنڈے نے ہماری ذہنیت برباد کردی، ہماری کمر توڑ دی اور ہمیں پست ہمت بنا دیا، حتیٰ کہ ہم اپنی ہستی کو بھول گئے۔ اس کی مثال عام نباتات میں ایسی ہو گی جیسے اوپر سے برف گر رہی ہو۔ اس طرح کا جو پروپیگنڈا ہوتا ہے، اسے عربی میں جادو سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی تندرست ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ وہ کام نہیں کر سکتا۔ حالانکہ وہ کام اسکی طاقت کے اندر ہے، اس حالت کو عربی میں جادو سے تعبیر کیا جائے گا کہ اس پر سحر ہوگیا ہے اور پروپیگنڈے کا یہ ادنیٰ کرشمہ ہے کہ وہ صرف ایک آدمی ہی نہیں بلکہ قوموں کی قومیں سمجھنے لگ جاتی ہیں کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے حالانکہ وہ سب کچھ کرسکتی ہیں۔ تو ایسی تمام طاقتیں جو باہر سے اثر ڈال کر ہماری ترقی کو روک دیں، ہم ان کے ضرر سے خدا کی پناہ میں آتے ہیں۔ گندم کے کھیت میں جو عقدہ ہوتا ہے وہ اچھا پانی جمع کر کے آگے پہنچاتا ہے۔ یہاں تک کہ انتخاب در انتخاب سے دانہ ہوتا ہے لیکن اگر کیڑا بھی اس عقدہ میں لگ جائے اور وہ اپنے زہریلے سانس کی پھونک لگائے تو گرہ اور عقدہ سست ہو جائے گا، پھر نباتات بڑھ نہیں سکتیں اور خوشہ پیدا نہیں ہوتا۔

آیت (۵) و من شر حاسد اذا حسد :- حاسد کو یہ تکلیف ہوتی ہے کہ فلاں آدمی کو یہ نعمت کیوں ملی، یہ چیز مجھے ملنی چاہیے تھی یعنی اس سے چھین کر اس (حاسد) کو ملنی چاہیے تھی۔ یہ ہے حاسد کی تعریف۔ (اگر انسان کسی کے پاس کوئی اچھی چیز دیکھے اور ایسی چیز کی تمنّا کرے تو یہ حسد نہیں ہے)۔ غرض

حاسد کو نظام قدرت پر اعتراض ہوتا ہے کہ اس شخص کو یہ چیز کیوں دی گئی
اس کے بجائے مجھے کیوں نہیں دی گئی۔ اس کی مثال یوں ہو سکتی ہے کہ کسی
شخص کو کاشتکار سے دشمنی ہے اور فقط اُس دشمنی کے باعث وہ نباتات کو کھیت سے
اکھاڑ کر باہر پھینک دیتا ہے، حالانکہ اسے نباتات سے کسی قسم کی دشمنی نہ
تھی۔ اسی طرح ایسی چیزیں جن کو نظامِ قدرت پر اعتراض ہے اور محض اسی لیے
ہماری دشمنی پر آمادہ ہوتی ہیں، ہم ان کے ضرر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آتے ہیں۔
اس طریقہ سے ہم نے تمام مخلوقات پر ایک اجمالی نظر ڈالی ہے اور انہیں اپنے نفع کے
اعتبار سے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا ہے اور ہر حصہ سے نفع حاصل کرنے کی
اصل قوت ہم اللہ تعالیٰ میں ثابت کرتے ہیں اور اسی کی پناہ میں آتے ہیں۔ اس طرح
عام مخلوقات کو اللہ تعالیٰ کی طرف ربط دینے کی قوت ہمارے اندر پیدا ہو جانے کی
اور اس سورت میں یہی مقصد تھا کہ ایک ایسی مثال پیدا کر دی جائے کہ تمام
تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف راجع کر سکے۔

## سُوْرَةُ النَّاسِ مَدَنِيَّةٌ وَهِيَ سِتُّ آيَاتٍ 114

سورهٔ ناس مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی چھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (۱) مَلِكِ النَّاسِ (۲) اِلٰهِ النَّاسِ (۳) مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ

تو کہہ میں پناہ میں آیا لوگوں کے رب کی لوگوں کے بادشاہ کی لوگوں کے معبود کی، بدی سے اُس کی جو بہکائے

الْخَنَّاسِ (۴) الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ (۵) مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ (۶)

اور چھپ جائے وہ جو خیال ڈالتا ہے لوگوں کے دل میں جنوں میں اور آدمیوں میں

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم○

# سورۃ الناس مکیۃ او مدنیۃ

سورت قل اعوذ برب الفلق میں تمام مخلوقات کو مرکز یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف ربط دے دیا اور اب یہ مطلب ہے کہ تمام انسانیت کو اس مرکز یعنی اللہ تعالیٰ سے ربط دے دیا جائے۔ یہ ہے فلسفے کا مطلب کہ آخر میں انسانیت کو مرکز سے ربط دے دیا جائے، تو فلسفہ مکمل ہو گیا یعنی ایک مرکز ثابت کرکے (قل ھو اللہ) پہلے بڑے نظام کو اس سے ربط دیا جائے اور آخر میں انسانیت کو بھی اس سے ربط دے دیا جائے۔

آیت (۱ تا ۳) قل اعوذ برب الناس، ملک الناس، اله الناس :- اللہ تعالیٰ کے تین نام بتلائے گئے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ انسانیت کا ربط واضح ہو جاتا ہے۔

(۱) قل اعوذ برب الناس :- لوگوں کے پالنے والے کی پناہ میں آتا ہوں ۔ وہ انسانیت کا رب ہے اور انسانیت کے لیے جس قدر سامان پرورش چاہیے وہ سب کچھ دیتا ہے۔ اس کا نمونہ ماں باپ ہیں کہ انسان، ماں باپ کو دیکھتا ہے کہ وہ اس کی پرورش کرتے ہیں۔ اس سے وہ ایک مفہوم لیتا ہے اور اس مفہوم اور معنے کو تربیت سمجھتا ہے ۔ ماں باپ کی جتنی قوت ہے وہ بہت تھوڑی اور محدود ہے اور احاطہ بھی ان کا چھوٹا ہے۔ بچپن میں آدمی اسی تربیت کو اپنے خیال میں بہت کافی سمجھتا ہے۔ مگر جب انسان ذرا بڑا ہو جاتا ہے تو اس کی اتنی ضرورتیں ہوتی ہیں کہ ماں باپ ان کو پورا نہیں کر سکتے ۔ اور اگر پورا کریں، تو بھی اس کی عقل اور دماغ اطمینان حاصل نہیں کرتا اور نہ اس کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ میرے ماں باپ محنت کر کے کچھ حاصل کرتے ہیں اور میری حالت یہ ہے کہ میں مفت خوروں کی مانند ان کے ساتھ لگا ہوا ہوں ۔ اسے اپنی یہ حالت ناگوار گزرتی ہے تو وہ اپنی ذمہ داری پر کام کرنا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن اسے اپنے کام میں ایسی مشکلات درپیش آتی ہیں کہ ان کو اس کے ماں باپ حل نہیں کر سکتے ۔ پھر وہ اپنی توجہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف منعطف کرتا ہے اور اسی کو پکارتا ہے۔ اس وقت اس کی مشکل حل ہو جاتی ہے اور اس حالت میں وہ اپنے اللہ تعالیٰ کو اپنا رب (پالنے والا) سمجھتا ہے اور مطمئن ہو جاتا ہے کہ میرا رب میرے ساتھ ہے۔

جس انسان نے اپنی عقل اور تجربہ سے اللہ تعالیٰ کو اپنا رب مان لیا ہے اس کو ہم اہل اللہ کہتے ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ سنی سنائی باتوں سے اللہ تعالیٰ کو اپنا رب مانتا ہو بلکہ اپنی عقل اور تجربہ سے اسے اپنا رب جانتا ہو۔ مثلاً اس شخص نے اپنے ماں باپ کو دیکھا کہ ان کے کام بھی اللہ تعالیٰ کرتا ہے اور اس کی پرورش بھی وہی کرتا ہے تو اس فہم و فراست کے ساتھ، جب وہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو یہ شخص ولی‌اللہ ہے۔

آیت (۲) ملك الناس :- اس کے بعد انسان کی دوسرے درجے کی ترقی ہے کہ وہ خاندان سے نکل کر سوسائٹی کا میمبر بن جاتا ہے اور سوسائٹی اپنا نظام قائم کرنے کے لیے اپنا ایک بادشاہ بنا لیتی ہے۔ تو اس سے انسان ایک نیا مفہوم لیتا ہے کہ ایک ہے بادشاہ اور دوسری ہے رعیت تو یہ اپنے آپ کو اس سوسائٹی کے سربراہ کی رعیت مانتا ہے۔ ایک حد تک اس کی ضرورتیں اس نظام میں پوری ہوتی رہتی ہیں لیکن اس کا دل و دماغ اتنا قوی ہو جاتا ہے کہ وہ اس موجودہ سوسائٹی پر قانع نہیں رہ سکتا اور وہ اس سے اونچی سوسائٹی پیدا کرنے کی ہمت کرتا ہے اس لیے وہ تمام انسانیت کے بادشاہ یعنے اللہ تعالیٰ سے رجوع ہوتا ہے کیونکہ اس کی طبیعت اسی بارگاہ سے مطمئن ہو سکتی ہے۔

آیت (۳) اله الناس :- انسان کی جو مجموعی خواہشیں ہیں ان کی ترقی سوسائٹی اور بادشاہ تک ختم ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد انسان کی ذہنی ترقی باقی رہتی ہے تو وہ ہر اس چیز سے جس میں وہ دلکشی کا سامان پاتا ہے محبت کرنے لگ جاتا ہے۔

دنیا میں بہت سی چیزیں محبوب ہیں اور ان سے انسان ترقی کرتا ہے۔ گویا ایک محبوب کے بعد دوسرے محبوب سے محبت کی اور اسی طرح آگے بڑھتا چلا گیا۔ انسان کو آخر درجہ کی ایسی صورت میسر آسکتی ہے کہ ایک اس کا باپ ہے پھر بادشاہ ہے اور پھر جتنی چیزوں کو یہ شخص دوست رکھ سکتا ہے وہ موجود ہیں۔ یعنی اس کا محبوب دوست مل جاتا ہے تو اس پر انسانی طبیعت کافی حد تک اطمینان اور سکون میں رہتی ہے۔ مگر انسانی زندگی محدود ہے۔ اس کو ذہنی بے چینی ہوتی ہے اور تکلیف ہوتی ہے تو اب اگر اس کا اللہ تعالیٰ سے ایسا تعارف ہو جائے جو تمام محبوبوں سے زیادہ محبوب ہے تو اس کی ترقی اپنے کمال کو پہنچ سکتی ہے اور وہ بے انتہا ترقی کر سکتا ہے اور یہ محبت کا سلسلہ رک نہیں سکتا۔ یہی صفت ہے جسے الٰہ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ وہ تمام انسانیت کا محبوب ہے۔ انسان کا ان تین صفتوں سے اللہ تعالیٰ سے تعلق ہو تو اس کی عقل کو پوری غذا مل جائے گی۔ اس محبت کو عام فہم بنانے کے لیے ضرر سے بچنے کا سامان بنا دیا گیا ہے کیونکہ انسانی صحت

ابتدا میں نفع اور نقصان کے سوائے کسی اور چیز کو نہیں سمجھ سکتی۔

آیت (۴) من شر الوسواس الخناس الآیہ :- پروپیگنڈے کی تشریح جس طرح پہلے کی جا چکی ہے (سورۃ الفلق میں) ایسی ہی تشریح یہاں بھی آتی ہے۔

محبت کی وجہ سے انسان کو ملامت کرنا سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز ہے۔

ع ملامت شحنۂ بازارِ عشق ست

اب اگر انسان کو اس کے محبوب سے ہٹانے والی کوئی جماعت ہو جو چاہے کہ اس کی یہ محبت نہ رہے تو اس جماعت کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اس انسان پر اپنا اثر ڈالتی ہے اور اسے اس کے محب سے ہٹانے میں ایک ضغطہ پیدا کرتی ہے۔ اس کو وسوسہ کہا جاتا ہے یعنے اس کے دل میں ایسے خطرات وقتاً فوقتاً پیدا کرتی ہے جس سے وہ محبت میں پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اس واسطے ہم اس عقیدے سے ہٹانے والی جماعت کے شر سے اور اس تعلق کو کمزور کرنے والی جماعت کے شر سے (جو وسوسہ ڈال کر اور طبع میں جس وسوسہ سے خطرات پیدا ہوں ان کو قلب میں ڈال کر پھر الگ ہو جاتی ہے) اپنے رب بادشاہ اور محبوب کی پناہ میں آتے ہیں۔ چونکہ وہ وسوسہ نہایت ملامت دہ چیز ہے (تکلیف دہ) اس لیے وہ ہمیں ایک ایک نقطہ پر ایذا دے گا لیکن اگر ہم اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوں گے تو ہمارا اپنے رب سے دائمی تعلق پیدا ہو جائے گا۔ پہلے بتلا دیا گیا ہے کہ جو شخص اپنی عقل اور تجربہ سے اپنے اللہ تعالیٰ کو مانتا ہے اسے ہم اہل اللہ کہتے ہیں۔ اسی طرح جو شخص اللہ تعالیٰ سے دائمی محبت پیدا کر لے اسے ولی اللہ کہیں گے اور انسانیت کی یہ آخری ترقی ہے۔ انہی لوگوں میں سے جو اللہ تعالیٰ کے دوست ہوتے ہیں فرشتے اور مقرب درگاہِ الٰہی کے اور سب کچھ ہوتے ہیں۔ یعنے محدثین اور ملهمین اور انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین۔

وسوسے سے بچنے پر ہم نے بات کو ختم کر دیا تھا اب اس کا ذکر آتا ہے:-

آیت (۴) من شر الوسواس :- وسوسہ ڈالنے والے شخص یا جماعت کا نام وسواس یعنے ہمیشہ وسوسہ ڈالنے والی جماعت اور اس کا کام بھی یہی ہے۔ **الخناس** وہ ہے کہ جب اس پر حملہ کیا جائے تو وہ چھپ جائے یا چھپنے والی طاقت۔ وہ اِس طرح پیش آتی ہے کہ انسان اس پر حملہ نہیں کر سکتا۔ بلکہ وہ بعض وقت اس کو اپنا دوست سمجھتا ہے کہ یہ مجھ کو خیر خواہانہ مشورہ دے رہا ہے۔ وہ کسی وقت ایسی بات بھی کہہ دیتا ہے کہ انسان کی ادھر توجہ نہیں ہوتی اور اس سے درحقیقت محبتِ الٰہی میں نقصان آتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

آیت (۵) الذین یوسوس فی صدور الناس :- وہ طاقت یا جماعت جو تمام انسانوں

کے سینے میں وسوسہ ڈالتی ہے۔ وہ حد سے زیادہ وسوسہ ڈالتی ہے، ہمیشہ وہ یہی کام کرتی ہے۔

آیۃ (٦) **من الجنة و الناس** :- وہ طاقت جنّات اور آدمیوں میں سے ہے۔ جنّات کے معنے چھپی ہوئی طاقت۔ چند آدمی جو ظاہری طور پر وسوسہ ڈال رہے ہیں وہ تو آدمیوں میں سے ہیں اور چند ایسی چھپی ہوئی طاقتیں اور جماعتیں ہیں جو خفیہ طور پر وسوسے ڈالتی ہیں اور یہ دونوں بہت زور شور سے اپنے کام میں مصروف ہیں اور برسات کی طرح خطرات کی بارش کر رہے ہیں۔ ان کے مقابلہ کی ہم میں طاقت نہیں ہے۔ ہم ان کے وسوسے کے شر سے اللہ تعالیٰ جل شانہ کی پناہ میں آتے ہیں۔ جب ہم نے وسوسہ کی جڑ ہی کاٹ دی تو اس کا خیال بننا، پھر ارادہ بننا، پھر عملی صورت اختیار کرنا، ہم ان تمام درجوں سے محفوظ ہو جائیں گے۔ اولاً انسان کے دل میں شبنم کی طرح خطرات آتے ہیں اور عقل اس کی طرف دیکھتی ہے۔ اگر اس کو وہ نا پسند ہوئے تو پھر ان کی طرف دوسری بار توجہ نہیں کرتا۔ اگر عقل کی نظر میں وہ خطرہ اچھا نظر آیا تو پھر اگر ایسا دوسرا خطرہ پیدا ہوگا تو وہ اس کو جگہ دے گا۔ اسی طرح رفتہ رفتہ عقل کی اس سے محبت ہو جاتی ہے، تو اب اس کو عقیدہ کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر عقل نے چاہا کہ اس کو عملی صورت دی جائے تو یہ ارادہ ہوا۔ اس کے بعد جب وہ کام کیا تو اس کے بعد اس کو اس کام میں سرور حاصل ہوگا یا ندامت۔ یہ خطرات کا ایک دورہ ہے۔ اب اس نے وہی کام دوسری، تیسری بار کیا تو اس کو ملکہ کہا جاتا ہے اور جب اس نے ہمیشہ اس پر مداومت کی تو اس کو اس کی طبع ثانی یا فطرت ثانی کہا جاتا ہے۔ یہ کمال ہے۔ اسی طرح انسانیت میں ایک طرف تو بصیرت بیدار رہے گی اور اسے علم رہے گا کہ کون سی چیز ضرر دے رہی ہے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ جل شانہ سے محبت تازہ بہ تازہ بڑھتی جائے گی۔ انسانیت کا اللہ تعالیٰ سے ربط آخری شکل میں بھی نتیجہ پیدا کرتا ہے۔

# سُوْرَةُ الفاتحة مَكِّيَّة وَهِيَ سَبْعُ آيَاتٍ

سورہ فاتحہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی سات آیتیں ہیں

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱)ۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (۲)ۙ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (۳)ؕ

سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو پالنے والا سارے جہان کا، بے حد مہربان رحم والا، مالک روز جزا کا،

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (۴)ؕ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (۵)ۙ

تیری ہی ہم بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں، بتلا ہم کو راہ سیدھی،

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (۶)ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ (۷)ع ۱ ع ۴۰

راہ اُن لوگوں کی جن پر تو نے فضل فرمایا، جن پر نہ تیرا غصہ ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

# سورۃ الفاتحہ مکیۃ

آیت (۱) **الحمد للہ رب العالمین**:۔ تمام جہانوں کا رب اللہ تعالیٰ ہے اور وہی ستائش کے قابل ہے ۔ کائنات عالم کو پیدا کرنے والی ایک ایسی ہستی ہے جس کے ہاتھ میں نظام عالم کی باگ ڈور ہے ۔ ریت کے ذرّات سے لے کر انسان جو اشرف المخلوقات کہلاتا ہے تمام اُسی کے تابع ہیں*۔ اُس کی صفتیں یہ ہیں:۔

آیت (۲) **الرحمٰن الرحیم**:۔ باپ اپنی اولاد کو کس شفقت اور پیار کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ تمام عالم میں سب سے زیادہ عزیز اُسے اپنی اولاد ہے مگر اس کے باوجود وہ اپنی اولاد کو بعض اوقات کسی بات پر سرزنش کرتا ہے ۔ اس کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ اس کی اولاد کی اصلاح ہوجائے ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات رحمٰن ہے وہ اپنے بندوں پر شفقت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور جب کبھی ان سے کوئی غلطی سرزد ہوتی ہے تو جس طرح باپ یا اُستاد سرزنش کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مصیبت آتی ہے ۔ اس میں بھی یہی راز مضمر ہے کہ میرے بندے اپنی غلطی کی اصلاح کریں ۔ اِسی خیال کو مد نظر رکھ کر عیسائی لوگ خدا کی ذات کو باپ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ماں اپنی اولاد کو جس شفقت کی نگاہ سے دیکھتی ہے! وہ وصف رحیم ہے اگر کسی قصور پر استاد سزا بھی دے تو ماں کی مامتا اُس سزا کو برداشت نہیں کرسکتی اور جھٹ شکایت کے لیے تیار ہوجاتی ہے ۔ اسی جذبے کے تحت ہندو لوگ ماں کو ماتا دیوی کہتے ہیں ۔ غرض ان دونوں جذبات کو مد نظر رکھ کر اسلام کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ماں باپ سے بڑھ کر اپنی مخلوقات کو عزیز رکھتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک دفعہ ایک غزوہ میں کوئی عورت گرفتار ہوکر آئی ۔ اس کا بچّہ گم ہوگیا تھا ۔ محبت کا یہ جوش تھا کہ کوئی بچّہ مل جاتا تو اُسے سینے سے لگا لیتی اور اس کو دودھ پلاتی ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو حاضرین سے فرمایا کہ "کیا یہ ہوسکتا ہے کہ عورت اپنے بچّے کو آگ میں

---

* اس کی مثال عدالت عالیہ ہے کہ ہر اپیل کا فیصلہ وہاں سے ہوتا ہے

ڈال دے" لوگوں نے عرض کیا، ہرگز نہیں ۔ فرمایا "تو خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ محبت ہے جتنی اس کو اپنے بچے سے ہے" ۔ ایک دفعہ ایک صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں ایک پرندہ کو چادر میں مع اس کے بچوں کے لپیٹے ہوئے لائے اور عرض کی "یا رسول اللہ، میں نے ایک جھاڑی سے ان بچوں کو اٹھا کر کپڑے میں لپیٹ لیا ۔ ان کی ماں نے جب یہ دیکھا تو میرے سر پر منڈلانے لگی ۔ میں نے زرا سا کپڑا کھول دیا تو وہ فوراً اپنے بچوں پر گر پڑی" ۔ ارشاد ہوا "کیا اپنے بچوں کے ساتھ ماں کی اس محبت پر تم کو تعجب ہے؟ قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے ۔ جو محبت اس ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہے، خدا کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے بدرجہا زیادہ ہے" ۔ اللہ تعالیٰ اس سے بدرجہا زیادہ رحمت کی نظر سے اپنے بندوں کو دیکھتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے رحمت کے ایک سو حصوں میں سے ایک حصہ دنیا پر نازل کیا ہے ۔ جس کا نتیجہ ہے ماں باپ کی اپنی اولاد سے محبت، انسان کی انسان سے محبت، حیوان کی حیوان سے محبت وغیرہ ۔ اب اگر کوئی شخص تمام کائنات کی محبت کو ازل سے لے کر ابد تک جمع کرے اور پھر اس مجموعے کو ایک سو (۱۰۰) سے ضرب دے تو اللہ تعالیٰ کی محبت کا کچھ اندازہ لگا سکتا ہے ۔

آمدم برسر مطلب ۔ جب انسانی سوسائٹی بن چکی تو ضرور ہے کہ اس میں باہمی تعلقات قائم ہوں ۔ اس لیے حکم ہوتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات رحیم ہے اسی طرح اس کے بندوں کو ایک دوسرے پر رحم کرنا چاہیے ۔ ایک کا حق دوسرا غصب نہ کرے ۔ اتفاق اور یک جہتی سے ایک دوسرے کے ساتھ رہیں ۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے پر زیادتی کرے گا تو حکم ہوتا ہے کہ :-

آیت (۳) مالک یوم الدین :- یعنی بندوں کو اس نے پیدا کیا ہے تو ان کا وہ حساب بھی ایک دن لے گا ۔ حساب لینے سے یہ مدعا نہیں کہ انسان کو سزا دی جائے بلکہ وہ ذات تو غفور رحیم ہے ۔ مدعا یہ ہے کہ انسان کی آلودگی کو دور کر کے اسے دوسری زندگی یعنی جنت میں از سر نو زندگی بخشی جائے ۔

آیت (۴) ایاك نعبد و ایاك نستعین :- ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں ۔ انسان نے تمام کائنات کو دیکھا اور اس سے اندازہ لگایا کہ اس تمام عالم کے اوپر ایک ذات ہے ۔ ہم اپنا سر نیاز اسی کے آگے ختم کرتے ہیں کیونکہ وہی ہمارا مالک اور کارساز ہے اور اسی سے ہم مدد مانگتے ہیں ۔ بڑے بڑے تونددالے جس قدر دنیا میں ہیں انہوں نے انسان پر ظلم وستم کر کے انسانی حقوق

غصب کرلیے اور انسانوں سے اپنی بندگی کرانے لگے - اے اللہ! ہم ان سے بیزار ہیں اور اب تجھی سے مدد مانگتے ہیں -

آیت (۵) **اھدنا الصراط المستقیم** :- اے اللہ ! جب تونے ہمیں بصارت عطا کی تو ہمیں سیدھے راستے پر چلنے کی ہمت اور توفیق دے -

آیت (۶) **صراط الذین انعمت علیھم** :- سیدھا راستہ ان لوگوں کا جن پر تونے نعمتیں نازل کیں - ابن عباس فرماتے ہیں :- جن پر نعمتیں نازل ہوئیں اُن کے چار مراتب ہیں: نبی ، صدیق ، شہداء اور صالحین (سورہ النساء - ایت ۶۹) - مطلب یہ ہے کہ اے پروردگار ایک ایسی سوسائٹی عطا کر جس کے اراکین ان چاروں مراتب والے ہوں -

غرض کہ مراد ہے اُن لوگوں کا راستہ جنہوں نے قرآن مجید یعنی فطرت الٰہی کے قانون کی پابندی کی اور پھر دنیا میں کامیاب زندگی بسر کی - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاے راشدین رض جو حضرت عثمان کی شہادت کے فتنے سے پہلے گزر چکے ہیں، وہ ہمارے لیے نمونہ ہیں - اُن کے بعد جو کوئی اُن کے نمونہ پر عمل کرے، وہ **انعمت** کا مصداق ہے - اس واسطے کہا گیا کہ اے اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے لوگوں کے راستہ پر چلا جن پر تونے اپنا انعام نازل کیا ہے -

آیت (۷) **غیر المغضوب علیھم ولا الضالین** :- نہ ان لوگوں کا جن پر تونے غضب نازل کیا - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جن پر غضب الٰہی نازل ہوا وہ یہود ہیں - اور بھٹکے ہوؤں سے مراد عیسائی ہیں - یہود پر غضب اِس لیے نازل ہوا کہ اُنہوں نے توراہ کی آیات مسخ کر ڈالیں اور اُن کے معانی اور مطالب اپنے مطالب پر ڈھال لیے - بعینہٖ اہل اسلام کے چند علماء بھی اسی طرح کر رہے ہیں اور قرآن کے معانی کو اپنے سانچےمیں ڈھال رہے ہیں اور اِس طرح مسلمانوں کو تباہ کر رہے ہیں - موجودہ زمانے میں بھٹکے ہوؤں سے مراد آج کل کا نوجوان طبقہ ہے جو گویا سیدھے راستے سے بھٹک گیا ہے - مگر سیدھا راستہ پانے کی جستجو کر رہا ہے، اِس لیے اُمید ہے کہ وہ منزل مقصود تک پہنچ جائے گا -

اور ان لوگوں کا راستہ نہ دکھلائیو جن پر تیرا غضب نازل ہوا - مراد ہے ان لوگوں کا راستہ جنہوں نے قرآن حکیم یعنی فطرت الٰہی کے قانون کی نافرمانی کی - اس لیے وہ دنیا میں ناکام رہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے غضب کی نشانی ہے - جو لوگ اِس نمونے کو سمجھتے ہیں جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ( یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاے راشدین کا نمونہ، فتنہ تک) مگر اس پر عمل کرنے کی ہمت نہیں رکھتے یا اللہ ! ہمیں ان لوگوں کا طریقہ نہیں چاہیے، وہ الضالین ہیں - اسی طرح جو لوگ اِس نمونہ ( رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین ) کو نہیں سمجھتے،

ہمیں آن کا بھی طریقہ نہیں چاہیے ، خواہ وہ کسی قدر ہی سمجھدار کیوں نہ ہوں -

اس سورہ" کا نام فاتحہ ہے - اور ایک حدیث میں اس کا نام صلواۃ بھی آیا ہے - اس حدیث میں ہے کہ جب انسان کہتا ہے کہ الحمد للہ رب العالمین تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ حمدنی عبدی - اور بھی اس سورہ" کے بہت نام ہیں - مگر اس کی تاریخ نزول یقینی نہیں کہی جاسکتی - یہ ایک عقلی بات ہے کہ پہلے سورہ" العلق نازل ہوئی اس میں ہے :- ارئیت الذین ینھیٰ عبدا اذا صلّی، گویا نماز ابتدائے نبوت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ پڑھتے تھے - تو یہ بات عقل میں نہیں آتی کہ نماز میں سورہ" الفاتحہ نہ پڑھی جاتی ہو - اسی لیے گمان ہوتا ہے کہ یہ سورۃالفاتحہ ابتدائے سال نبوت میں نازل ہوئی ہو - واللہ اعلم - مگر کوئی روایت نہیں ملتی - اور حدیث میں آتا ہے کہ سورہ" الفاتحہ کے مثل نہ توراۃ" میں ہے اور نہ انجیل میں ہے - وغیر ذالک تو یقیناً سمجھا سکتا ہے کہ سورہ" الفاتحہ بعد اقرء کے نازل ہوئی- ابن مسعود رض نے اپنے قرآن میں سورہ" الفاتحہ اس لیے نہیں لکھی تھی کہ وہ تو نماز کے لیے سکھلائی گئی ہے- پس ان تمام باتوں سے یقین ہوتا ہے کہ جب سے نماز فرض ہوئی اسی وقت یہ سورۃ الفاتحہ نازل ہوئی ہے -

سورۃ العلق ... واللہ اعلم

تمت بالخیر

مطبوع
سنڌ يوني ورسٽي پريس - حيدرآباد ( پاڪستان )
شائع ڪرده
نظام الدين هالي پوٽو - پروپرائٽر، انٽرنيشنل بڪ ڪارپوريشن -
هيرآباد - حيدرآباد (پاڪستان)

# تصحیح نامہ

نوٹ:۔ افسوس ہے کہ باوجود سخت محنت اور کوشش کے پروف کی کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں۔ قارئین حضرات براہ کرم مندرجہ ذیل اغلاط کی تصحیح فرمائیں۔

| صفحہ | سطر | غلط | صحیح |
|---|---|---|---|
| ۱۳ | ۱۴ | دوست | درست |
| ۱۷ | ۴ | نذار | الزار |
| ۱۹ | ۲۷ | سجا | سبحا |
| ۲۲ | ۲۵ | معاوفہ | معاوضہ |
| ۲۳ | ۲ | قطرق | فطرت |
| ۲۳ | ۱۲ | قیامت | قیامت |
| ۳۲ | ۱۰ | جوڑے | جوڑے |
| ۳۹ | ۱۶ | مثول | متداول |
| ۴۵ | ۸ | ملہوظ | ملحوظ |
| ۴۵ | ۱۸ | [illegible] | [illegible] |
| ۶۱ | ۱ | الاسناق | الاشتقاق |
| ۵۳ | ۱۶ | [illegible] | [illegible] |

| صفحہ | سطر | غلط | صحیح |
|---|---|---|---|
| ۸۴ | ۷ | الذی | لذی |
| ۸۶ | ۸ | کرنے | کرتے ہو |
| ۸۷ | ۱۰ - ۱۱ | خطیرۃ القدس | حظیرۃ القدس |
| ۹۱ | ۴ | اقلیت | عقلیت |
| ۹۱ | ۱۴ | تالیٰ | تعالیٰ |
| ۹۱ | ۲۴ | طرف | طرز |
| ۹۳ | ۱۷ | ایمپائر | ایمپرر |
| ۹۴ | ۶ | شہر کی | شہر میں |
| ۹۴ | ۶ | جفنے | جنے |
| ۱۰ | ۶ | عمل نے | عقل نے |
| ۱۰۵ | ۱ | نہیں دینا | نہیں جانے دینا |
| ۱۰۷ | ۲۱ | خطرات نہیں | خطرات ہیں |
| ۱۱۰ | ۳ | تعالیٰ اِس | تعالیٰ کے اِس |
| ۱۲۱ | ۲۰ | مدات | معدات |
| ۱۲۲ | ۱۸ | کیا | کرو |
| ۱۲۶ | ۶ | کوشش | کشش |
| ۱۳۸ | ۶ | کصری | کسرے |
| ۱۴۵ | ۱۰ | حسینی | حسنی |
| ۱۷۹ | ۳۰ | نسلی تنافر | نسلی تفاخر |
| ۱۸۳ | ۱۲ | مفاجات | مناجات |
| ۱۹۸ | ۲۴ | العلق | الفلق |
| ۲۲۴ | ۷ | النّاس | العنّاء |

المقام المحمود

تفسیر جزء عم

مولانا عبید اللہ السندی

جامع و مؤلف

مولانا عبداللہ لغاری

# تفسير مقام المحمود

## لمؤلانا عبيدالله السندي

## حصه دوئم :

## سورة واضحيٰ الي الناس و الفاتحه

## صفحه 111 تا 227 وغيره

## تفسير شيخ مولانا عبيدالله السندي

## تاليف : مولانا عبدالله لغاري